....(ص ۹) قبل اس کے کہ ہم اس دشوار تجسس کو شروع کریں (ص ۱۳) اس خرافات مواد کا اگر ....(ص ۵۴) چونکہ تلسی اوتاری انسان .... (ص ۵۵) پرانے شعراء میں شاذ ہی ایسے مجموعے ہوں گے (ص ۳۷) وہ بچپن ہی سے ایک سنیاسی گرد کے زیر سایہ پرورش ہوئے (ص ۵۸) شرینڈھو ہندی کے نامور مصنف ہیں، ان کا عہد وقوع آج سے ۵، سال قبل سمجھنا چاہئے (ص ۹۲) ایسی مثالوں کو زہر میں ڈوب دے کر اچھالنا ادیب کا کام نہیں ہے (ص ۱۱۵) ان محاسن پر سارا ہندوستان گرویدہ رہا (ص ۲۸۲)، مندرجۂ ذیل جملوں میں الفاظ کی تقدیم و تاخیر کا خیال نہیں کیا گیا ہے: "ایک تقریباً دو سو سال پرانی کتاب" (ص ۴۴) تلسی کے عہد میں جو ہندو سماج کی تہذیب رائج تھی (ص ۱۱۲) ایک جگہ بچپن کو بھپن لکھا ہے۔ "تقریباً ساڑھے چار سو سال کے بھپن پر پھیلے ہوئے مواد .... (ص ۵) جورت کو مذکر لکھا ہے۔

صحیفۂ زندگی: از مولانا عزیز الحق کوثر ندوی تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۱۴۰

قیمت ۵ روپے، پتہ: مکتبہ سراجیہ ۸، ۷/۳۱ ججی باغ، وارانسی۔

مولانا عزیز الحق کوثر ندوی کو درس وتدریس اور وعظ وارشاد کے علاوہ تصنیف و تالیف اور شعر وسخن کا بھی اچھا ذوق ہے، ان کے قلم سے مختلف علمی ودینی موضوعات پر کئی مفید رسالے نکل چکے ہیں، "صحیفۂ زندگی" ان کے کلام کا مجموعہ ہے، اس میں دینی واخلاقی تعلیمات اور تصوف وسلوک کے حقائق بیان کرکے روح کی بالیدگی کا سامان بہم پہونچایا ہے، اور قلب وذہن کی صفائی، سیرت وکردار کی پاکیزگی اور معاشرہ کی اصلاح کا درس دیا ہے مگر خیالات ومضامین کی گرانباری سے نظم کی روانی، اشعار کی موزونی اور بندش کی چستی وغیرہ میں کوئی فرق نہیں آنے پایا ہے اس اعتبار سے "صحیفۂ زندگی" اسم با مسمّیٰ ہے۔

"ض"

جلد ۱۲۴ ماہ محرم الحرام ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۹ء عدد ۶

مضامین

شذرات

چودھویں صدی ہجری ختم اور پندرھویں صدی شروع ہونے کو ہے ان چودہ سو برسوں میں اسلام تو اپنی تعلیمات کے ساتھ اٹل رہا لیکن مسلمانوں کی تاریخ اس مدت میں تابناک رہی تو اندوہناک بھی بنی رہی جو پیچھے مڑکر دیکھی جا سکتی ہے،

عہد رسالت خدا ترسی، ایمان پروری، زبان، دل اور عمل کی سچائی، عہد کی پابندی، عدل پروری، خاکساری، خودداری، اخوت کی جہانگیری، اور محبت کی فراوانی سے جگمگا اٹھا تھا، جن کی تقلید سے آج بھی انسانیت سنواری جا سکتی ہے، اس زمانہ میں مسلمان بدر اور دوسرے غزوات میں ایمان کی جس قوت اور حرارت سے لڑے اس سے ان کو ہر طرح کی سربلندی حاصل ہوئی مگر اسی عہد میں ان کو احد اور حنین کی لڑائیوں سے یہ درس ملا کہ ان کی تھوڑی سی غلطیوں اور فروگذاشتوں سے ان کے رسول صلعم کو بھی مشکلوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

خلافت راشدہ کے زمانہ میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے جو مثالی حکومت قائم کی، یا اس پورے دور میں اتباع شریعت، نظام عدل، بیت المال کے صحیح استعمال، مجلس شوریٰ کی اہمیت، رائے کی آزادی، انسانی حقوق کے احترام، عوام کی فلاح و بہبود اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جو مثالیں پیش کی گئیں، ان میں وہ ساری باتیں موجود ہیں جن کو بنیاد بنا کر اچھی سے اچھی فلاحی حکومت قائم کی جا سکتی ہے اس عہد کے صحابہ کرامؓ نے انسان دوستی، خدمت خلق، اطاعت گذاری، عبادت و ریاضت، مودت و الفت، خوف الٰہی اور محبت رسول کے جو نمونے پیش کئے ان سے نہ صرف اسلامی بلکہ انسانی اخلاق کی تاریخ زریں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے،

اس عہد میں ایران، شام، بیت المقدس، عراق، طرابلس، مصر، ایشیائے کوچک، قبرص، خراسان، طخارستان اور جرجان وغیرہ کی فتوحات کی تفصیل پڑھ کر ایمانی حرارت پیدا ہوتی ہے حضرت اسامہؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ، حضرت عبداللہ بن عامرؓ اور حضرت سعید بن العاصؓ جیسے فوجی قائدین سے مسلمانوں کی سپہگری اور نبرد آزمائی کی تاریخ بھی زریں بنی، مگر اسی دور کی دکھ بھری کہانی یہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ شہید ہوئے، جنگ جمل بھی ہوئی جس میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیر بن عوامؓ جیسے اکابر صحابہ اللہ کو پیارے ہوئے، جنگ صفین بھی آپس ہی کے اختلاف کی لڑائی تھی جس میں ایک لاکھ آدمی جاں بحق ہوئے، عمرو بن العاصؓ کے فیصلے سے اختلاف کی بنیاد پڑی تو بنو ہاشم اور بنو امیہ میں مستقل عناد پیدا ہو گیا، خارجیوں کا فرقہ وجود میں آیا حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد خلافت کے بجائے ملوکیت قائم ہو گئی۔

بنو امیہ نے مسلمانوں کی حکومت کا دائرہ بہت وسیع کر دیا ان کی مملکت کے اندر حجاز، عراق، عمان، بحرین، کرمان، سیستان، کابل، خراسان، سندھ، موصل، آذربائجان، آرمینیا، دمشق، اردن، حمص، مصر اور شمالی افریقہ کے سارے علاقے رفتہ رفتہ آ گئے، اندلس، سسلی، سارڈینیا اور بحیرۂ روم کے جزیرے بھی شامل تھے ان کی فوجیں اندلس سے نکل کر پرتگال اور فرانس کے حدود میں داخل ہو گئی تھیں یہ ایسے فوجی کارنامے ہیں جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے ان کے فرماں رواؤں میں سے ولید، سلیمان اور ہشام کی سطوت اور حشمت سے رومی اور عیسائی سلطنتیں بھی لرزہ براندام رہیں مگر ان ہی کے عہد میں کربلا کا المناک واقعہ پیش آیا حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے خلاف لشکر کشی میں خانہ کعبہ پر بھی آتش باری کی گئی، ان کی لاش تین دن سولی پر لٹکتی رہی، اور جب ولید بن عبدالملک کے زمانہ کے فوجی قائدین میں قتیبہ بن مسلم، موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم نے اسلام کا جھنڈا ترکستان، بخارا، سمرقند، غرناطہ، قرطبہ، طلیطلہ، طوانہ، عمرانہ، مرطوس اور سندھ پر لہرایا تو یہ بھی المیہ ہے کہ اسی خاندان کے حکمراں سلیمان بن عبدالملک کے عہد میں یہ چاروں مایۂ ناز فوجی قائدین موت کے گھاٹ اتار دئے گئے۔

یہ کیسا دردناک پہلو ہے کہ اسلام ساری تفریق مٹانے آیا تھا، مگر بنو ہاشم بنو امیہ کو برا سمجھنے لگے شیعیان علیؓ خلفائے ثلاثہؓ اور ان کے بعد کے تمام مسلمان حکمرانوں کو غیظ و غضب کی نظر سے دیکھنے لگے، خارجیوں نے امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ دونوں کے حامیوں کو گمراہ خیال کیا، عربی اور عجمی، عدنانی اور قحطانی، یمنی اور مضری کے نسلی امتیازات اور باہمی تعصبات بھی اچھی طرح ابھر گئے، حسد، رقابت، عناد اور نفاق اسلام کی تعلیم کے منافی ہے، مگر ان رذائل کی

بدولت ولید ثانی اور یزید بن عبدالملک کا قتل بھی ہوا اور جب عباسیوں نے بنوامیہ کو مغلوب کیا تو ان کو چن چن کر قتل کیا اور ان کے اسلاف کی قبریں کھدوا دیں۔

بنوعباس کی حکومت تقریباً پانچ سو برس رہی، ان کی سلطنت کے حدود بنوامیہ سے تو نہیں بڑھے مگر ان کے فرماں رواؤں میں منصور کے زمانہ سے عباسی خلفاء روحانی پیشوا بھی تسلیم کئے جانے لگے، ہارون رشید کے عہد کی تمدنی شان وشوکت، علوم وفنون کی ترقی، سیاسی بیدارمغزی، انتظامی اور فوجی قوت میں دنیا کی شاید ہی کوئی حکومت اس کا مقابلہ کرسکتی تھی، مامون رشید کے عہد میں جو علمی ترقی ہوئی وہ بھی مسلمانوں کی تاریخ کا زریں باب ہے۔

اسی کے ساتھ ان صدیوں میں مسلمانوں کے اختلافات کی تاریخ بھی دردناک رہی، علویوں، خارجیوں اور زندیقوں کو زیر کرنے میں جانی اور مالی نقصانات ہوتے رہے، باہمی نفاق کی وجہ سے ابوسلمہ، جعفر برمکی، فضل بن سہل، ابراہیم بن علی، موسیٰ بن مصعب، نظام الملک طوسی، مامون رشید کے بھائی امین اور خلیفہ متوکل علی اللہ کا قتل بھی ہوا، مختلف علاقوں کے مسلمان حاکم مسلمانوں ہی کی حکومت کے خلاف بغاوتیں بھی کرتے رہے۔

جن علاقوں کی بغاوتیں سر نہ ہوسکیں، وہاں خودمختار حکومتیں قائم ہوتی گئیں، اندلس میں اموی خلافت قائم ہوگئی، مصر میں فاطمیوں کی حکومت بن گئی، شمالی افریقہ میں ادریسی، قیروان اور صقلیہ میں اغلبی، یمن میں محمد بن ابراہیم نے زیادی، خراسان میں طاہر بن حسین نے طاہری، دیلم اور طبرستان کے کوہستانی علاقہ میں علوی، سیستان میں صفاری، ماوراءالنہر میں سامانی، دیلم کے علاقہ میں آل بویہ نے دیلمی، وسط ایشیا میں سلجوقی، اور موصل میں زنگی اور ایوبی حکومتیں علیحدہ علیحدہ قائم ہوگئیں۔

ان خاندانوں کے فرمانرواؤں میں کچھ ایسے بھی گذرے جن پر مسلمانوں کو فخر ہوسکتا ہے، اندلس کے عبدالرحمن اول، اور ہشام بن عبدالرحمن نے قرطبہ کو سجا کر نادرۂ روزگار بنا دیا، وہاں کے عبدالرحمن ناصر کی فوج دنیا کی بہترین فوج سمجھی جاتی تھی، حکم ثانی کے زمانہ میں اندلس علم وفن کا قابل رشک مرکز بن گیا تھا، سلجوقیوں میں طغرل نے

ایک عالم کو اپنے سامنے جھکا لیا تھا اس لئے سلطان العالم کہلاتا تھا، اسی خاندان کا ملک شاہ اپنی جہاں بانی کی بنا پر دنیا کے بہترین فرمانرواؤں میں شمار کیا جاتا تھا، زنگی خاندان میں نورالدین زنگی نے خلفائے راشدین کی یاد تازہ کردی تھی، صلاح الدین ایوبی اپنی حکمرانی اور صلیبی لڑائیوں میں اپنی ہوشمندانہ پامردی کی وجہ سے آج بھی حکمرانوں کے لئے مشعلِ ہدایت ہے، اس نے بیت المقدس فتح کیا تو یورپ کے فرمانروا اپنی مشترکہ کوششوں کے باوجود اس کو اس سے واپس نہ لے سکے۔

نسلی، قبائلی، علاقائی اور ذاتی مفاد پرستی میں جو چھوٹی بڑی حکومتیں قائم ہوئیں وہ سب رفتہ رفتہ ختم ہوگئیں، ان کے زوال کے اسباب جہاں سیاسی، اقتصادی، فوجی اور معاشرتی تھے، وہاں ایک بڑا سبب ان کی باہمی آویزش بھی تھی ان میں اتفاق کے بجائے نفاق، اتحاد کے بجائے انتشار اور یگانگت کے بجائے منافرت رہی، یورپ کے عیسائی اندلس میں مسلمانوں کی حکومت کی بیخ کنی میں برابر لگے ہوئے تھے، ایسے موقع پر وہاں کے مسلمانوں کو متحد رہنا چاہئے تھا، مگر ان کو مصر کے فاطمیوں سے برابر خطرہ رہا، اندرونی طور پر بنوعامر، بنوحمود، بنوذوالنون، المورودی، موحدی اور بنواحمار وغیرہ کے جھگڑے جاری رہے، پھر بربری مسلمانوں اور ملوک عربوں کے باہمی اختلافات نے آگ پر تیل ڈالا، اس طرح ساڑھے آٹھ سو برس کے بعد مسلمان اس ملک سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئے، جس سے عالم اسلام کے مسلمانوں کی عزت وناموس پر اغیار کو ہنسنے کا موقع اس لئے ملا کہ ع عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال وپر نکلے۔

ان ریاستوں کی علیحدگی پسندی سے بنوعباس کی حکومت بھی کمزور ہوتی گئی، ہاشمیوں اور علویوں کے تنازع، عربوں، عجمیوں اور ترکوں، شیعوں اور سنیوں، حنفیوں اور حنبلیوں کی باہمی آویزشوں سے یہ اور بھی بے جان ہوگئی، اس سے فائدہ اٹھا کر تاتاریوں نے اس کو روند ڈالا تو مسلمانوں کی ایک ایسی حکومت کا خاتمہ ہوگیا جس کے پیچھے بڑی شاندار روایات تھیں۔

تاتاریوں نے سلجوقیوں کو بھی تہس نہس کیا مگر ان کی خاک سے ایشیائے کوچک میں دولت عثمانیہ ابھری جو آگے چل کر ٹرکش امپائر کہلائی، ایک زمانہ تھا کہ اس کے قلمرو میں مشرق وسطی کے علاوہ یورپ میں سردیہ، بلغاریہ، سلونیکا، البانیہ، بوسنیا، روڈس، ہنگری، بلغراڈ اور کریمیا وغیرہ بھی تھے، سلطان محمد فاتح تو روم کو بھی فتح کرنا چاہتا تھا،

سلطان سلیم اول کے بعد تو یہاں کے سلاطین مسلمانوں کے خلیفہ بھی ہو گئے، سلطان سلیمان اعظم کے نام سے یورپ کی سلطنتیں بھی لرزتی تھیں، سلطان سلیم ثالث نے تو فرانس کے نپولین اعظم سے بھی ٹکر لی، سلطان عبدالحمید کے زمانہ میں عثمان پاشا نے روس سے ایسی بہادرانہ جنگ کی کہ وہ شیر پلونا کے نام سے مشہور ہوئے۔

یورپ کے عیسائیوں کی نظروں میں دولت عثمانیہ بھی برابر کھٹکتی رہی، ترکوں کو محتاط بن کر اپنی یکجہتی کا ثبوت دینا چاہئے تھا، مگر ان میں بھی اندرونی طور پر بڑا اختلاف رہا، سلطان عثمان دوم اور سلطان سلیم ثالث قتل کئے گئے، سلطان مصطفی، سلطان ابراہیم، سلطان مصطفیٰ دوم اور سلطان عبدالحمید ثانی معزول کئے گئے، سلطان مراد اور سلطان احمد سوم کے وزیر اعظم بھی ہلاک کئے گئے، ترکوں نے نومسلم عیسائیوں کی ایک فوج انکشاریہ کے نام سے تیار کی تھی، ان کی ریشہ دوانیوں سے اندرونی طور پر بڑا انتشار رہا۔

ایران کے صفوی سلاطین نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا تو وہ ترکوں کے معاند بن گئے، وہاں نادر شاہ کے حملوں نے ان کو اور کمزور کر دیا، مصر کی ماتحت ریاست ذوالقدریہ نے ان سے سرکشی اختیار کی، ان اختلافات سے یورپ کی عیسائی حکومتیں کیوں نہ فائدہ اٹھاتیں، سلطان عبدالحمید ثانی کے زمانہ میں انگریزوں نے قبرص پر قبضہ کر لیا، مصر کو بھی اپنی نگرانی میں لے لیا، سوڈان پر لارڈ کچنر کا غاصبانہ اقتدار ہو گیا، اٹلی نے طرابلس کو زیر نگیں کر لیا، پھر یورپ کے سامراجیوں نے بلقان کی جنگ چھیڑ کر ترکوں کے یورپی علاقوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور جب ترکوں نے پہلی جنگ عظیم میں جرمنوں کا ساتھ دیا تو ان کی شکست کے بعد حجاز، عراق اور فلسطین کو انگریزوں نے لے لیا، شام فرانس کے قبضہ میں آ گیا، ایشیائے کوچک یونان کو ملا، قسطنطنیہ اور آبنائے فاسفورس سب کی مشترکہ ملکیت میں آ گئے، سلطان عبدالحمید دوم کی خلافت ختم کر دی گئی تو دولت عثمانیہ کا دور بھی تقریباً ساڑھے چھ سو برس کے بعد ختم ہو گیا، ترکی میں جمہوری حکومت مصطفے کمال کی صدارت میں قائم ہوئی مگر خلافت کی وجہ سے مسلمانوں کی جو مرکزیت تھی وہ جاتی رہی۔

اور جب مسلمانوں کی حکومتیں علٰحدہ علٰحدہ قائم ہو رہی تھیں تو چوتھی صدی ہجری میں افغانستان میں غزنویوں کی حکومت قائم ہوئی جو تقریباً ڈیڑھ سو برس رہی، سلطان محمود غزنوی دنیا کے عظیم ترین فاتحوں اور حکمرانوں میں شمار کیا جاتا ہے، مگر غزنویوں کا خاتمہ غوریوں کے ہاتھوں ہوا، شہاب الدین غوری کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی باضابطہ حکومت قائم ہوئی جو مختلف خاندانوں میں منتقل ہو کر ساڑھے چھ سو برس تک رہی، غلام سلاطین میں قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش اور غیاث الدین بلبن خلجیوں میں علاء الدین خلجی، تغلقوں میں محمد بن تغلق اور فیروز شاہ تغلق افغانوں میں شیر شاہ مغلوں میں بابر، اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے کارناموں پر مسلمان فخر کر سکتے ہیں، انھوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں ہندوستان کو جنت نشان بنا دیا تھا۔

مگر یہاں بھی مسلمانوں کی حکومت میں افراتفری رہی، تیمور مسلمان تھا، مگر دہلی پر حملہ کر کے ایک مسلمان کی حکومت کو بے جان کر گیا، امراء برابر آپس میں لڑتے رہے، مغلوں کے آخری دور میں ہندوستانی اور غیر ہندوستانی شیعہ اور سنی امراء کے اختلافات سے حکومت کی بنیاد دہل گئی، پھر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی پر کلنک کا ٹیکہ ہمیشہ کے لئے لگ گیا کہ مسلمانوں کی ایک سلطنت پر حملہ آور ہو کر اس کو ختم کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔

چودھویں صدی ہجری میں نجد، حجاز، عسیر، یمن، مجع امارات نواحی تسعہ، بحرین، کویت، عراق بشمول فلسطین و شام اور مصر میں بظاہر عربوں کی حکومتیں رہیں، مگر ان پر یورپ کی سامراجی قوتیں چھائی رہیں، ان میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی تو مصر، سوڈان، عراق اور حجاز کو انگریزوں کی سامراجیت سے برات ہوئی، الجزائر اور مراکش فرانسیسیوں کی غلامی سے آزاد ہوئے، یمن، ٹیونس اور لبنان کو بھی آزادی ملی، مگر فرنگی میکاولیوں نے عراق سے اردن کو کاٹ دیا، یمن کے دو ٹکڑے کر دیئے، لبنان کو عیسائیوں اور عربوں کے لئے وجہ تنازعہ بنا دیا، فلسطین اور خصوصاً بیت المقدس پر اسرائیلیوں کا قبضہ کرا دیا

کچھ نئی ریاستیں بھی بنیں، بحرین، قطر اور ابوظہبی انگریزوں کے اثر سے آزاد ہوئیں تو عرب امارات کے نام سے اپنا وفاق بنایا، مسقط، عمان، زنجبار کی اب علٰحدہ ریاستیں ہیں، افریقہ میں لیبیا، نائجیریا اور مالی میں مسلمانوں کی حکومتیں ہیں، انڈونیشیا ولندیزیوں سے آزاد ہو کر اس وقت سب سے بڑی مسلم ریاست ہے، ملیشیا بھی اب ایک مسلم ریاست بن گئی ہے، پاکستان ہندوستانی مسلمانوں کی بڑی قربانیوں سے وجود میں آیا، مگر باہمی آویزش سے اس کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے، بنگلہ دیش اب ایک علٰحدہ مسلم ریاست ہے۔

عربوں نے قومیت کے سہارے اپنے کو منظم کرنے کی کوشش کی مگر ترکش امپائر نے ان کو جتنا متحد کیا تھا اتنا وہ عرب قومیت کے نام پر

متحد نہ ہو سکے، سعودی عرب کے شاہ فیصل مرحوم نے تمام مسلمانوں کو اسلام کی لڑی میں پرونے کی کوشش کی، مگر وہ اپنے ایک عزیز کے ہاتھوں ہی لقمۂ اجل بنے، اب سارے عرب حکمتِ فرنگی سے سیاسی کھلونے بن کر رہ گئے ہیں، ع جو سراپا ناز تھے ہیں مجبور نیاز۔

جمال الدین افغانی نے بھی پان اسلام ازم کی تحریک چلائی تھی ڈاکٹر محمد اقبال کی تمنا تھی کہ نیل کے ساحل سے کاشغر کی خاک تک مسلمان ایک ہوں، مگر وہ اپنی آرزوؤں کے خواب کی تعبیر کیا دیکھتے کہ سمرقند، بخارا اور تاشقند جہاں سے اسلامی علوم و فنون کا سرچشمہ بہا تھا کمیونزم کے زیر اثر ہیں، عراق اور شام نے اسلامی تعلیمات کو چھوڑ کر اشتراکی خیالات کو اپنایا ہے، افغانستان روس کی گود میں جانے کی کوشش کر رہا ہے، سعودی عرب، پاکستان اور ایران سے اسلامی دستور کی آواز بلند ہوئی، مگر اب تک اس کے عملی پہلو وہاں سامنے نہیں آئے ہیں، ایران اسلامی انقلاب کے نام پر خون کی ہولی کھیل رہا ہے۔

مسلمان اپنی نسبت ابراہیمی سے معمار جہاں بننے کے لئے آئے تھے وہ راز کن فکان تھے آخری نبوت کے ارمغاں تھے زمین ایشیا کے پاسبان بنائے گئے تھے، مگر وہ سوچیں کہ اب کیا ہیں؟ یہ صحیح کہ کسی زمانہ میں انھوں نے جہانداری، جہانبانی اور جہاں بینی کی اعلیٰ مثالیں پیش کیں مگر اب وہ اپنے عروج سے زیادہ اپنے زوال کے اسباب پر غور کریں وہ اسلامی اخلاق کے فضائل سے آراستہ رہے تو ابھر کر جھپٹے پلٹے اور پلٹ کر جھپٹے مگر دنیاوی اخلاق کے رذائل میں مبتلا ہوئے تو گرے اور گرتے چلے گئے، اسلام کی تعلیم تھی کہ مسلمان اپنی یگانگت اور مؤانست میں سیسے کی دیوار بنے رہیں، کسی ایک مسلمان کے تلوے میں خار چبھے تو دوسرا مسلمان اس کی خلش اپنے سارے جسم میں محسوس کرے مگر ان کی تاریخ میں ان کی باہمی عداوت، فرقہ پسندی اور نفاق پروری کی ایسی مثالیں ہیں کہ حالی نے آزردہ ہو کر کہا تھا

کہ نااتفاقی نے کھویا ہے ہم کو	اسی جزر و مد نے ڈبویا ہے ہم کو

اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ

نہیں جانتے یہ کہ جاتے کدھر ہیں	گئے بھول رستہ وہ یا راہ پر ہیں

ان کے دل کی درد بھری آواز یہ بھی تھی کہ

انھیں کل کی فکر آج کرنی سکھا دے	ذرا ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھا دے

حالی کے بعد اقبال نے یہ پیام دیا تھا ع تو مسلمان ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری۔

پندرھویں صدی کا آغاز بھی مسلمانوں کو یہی پیام دیگا

مقالات

سنائی کا مذہب

از

جناب ڈاکٹر نذیر احمد، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

(۲)

سنائی کی حدیقہ کے مطبوعہ نسخے میں حضرات خلفاے اربعہؓ کی مدح میں قرآن و حدیث وغیرہ کے جو اقتباسات نقل ہوئے ہیں، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنائی کے نزدیک ہر ایک کا کیا مقام تھا، حضرت ابو بکر صدیقؓ کے بارے میں فرماتے ہیں[1]:-

ذکر ابی بکر الصدیق الاطہرؓ	ابو بکر صدیق اطہرؓ، شیخ اکبر، وزیر
الشیخ الاکبر، الوزیر الانور،	روشن فکر، بزرگ و منتخب روزگار،
العتیق الازھر، الصاحب فی	یار غار، سختیوں اور اسرار میں معتمد
الغار، المؤتمن فی الشدائد	علیہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
والاسرار، المنفق لرسول	کے لئے چالیس ہزار دینار صرف
اللہ اربعین الف دینار، حبیب	کرنے والے، اللہ تعالیٰ کے حبیب کے
حبیب الملک الجبار، الذی	حبیب، جن کی شان میں قرآن کی

---

[1] ل ص ۲۲۶ بعد

انزل اللہ تعالی فی شانہٖ:
والذی جاء بالصدق[1]
وصدق بہ اولٰئک ھم
المتقون، وقال النبی صلی
اللہ علیہ وآلہ وسلم:-
ھذا کھول اھل الجنۃ من
الاولین والآخرین الا
النبیین والمرسلین، وقال
علیہ السلام: انت عتیق
اللہ من النار، فسمی عتیقاً
وسئل الجنید عن قول النبی
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
لابی بکر: انت عتیق اللہ
من النار الخ قال: لانہ عتیق
من مشاھدۃ الکونین لا
یشاھد مع اللہ غیر اللہ،
.... وقال علیہ السلام:
ولو کنت متخذا من امتی
خلیلا لاتخذت ابابکر

آیت: "والذی جاء بالصدق الخ"
(وہ شخص جو سچ بات لے کر آیا، اور
جس نے اُس کو سچ جانا، تو یہ لوگ
پرہیزگار ہیں) نازل ہوئی ان
کا ذکر، اور فرمایا رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے انبیاء
اور مرسلینؑ کے سارے اگلوں اور
پچھلوں میں وہ (ابوبکر صدیقؓ) اہلِ
جنت کے بزرگ ہیں، اور فرمایا حضور
علیہ السلام نے آپ کو اللہ نے جہنم کی
آگ سے بچایا ہے، پس آپ کا نام عتیق
ہوا، حضرت جنیدؒ سے حضرت ابوبکرؓ
سے متعلق حضور علیہ السلام کے قول:
انت عتیق اللہ الخ کے بارہ میں
سوال کیا گیا، انھوں نے جواب میں
فرمایا، اس لئے کہ وہ مشاہدۂ کونین
سے فارغ ہیں، اس لئے کہ اللہ کے
ساتھ غیر اللہ کا مشاہدہ نہیں چاہیئے،
اور حضور علیہ السلام نے فرمایا، اگر میں

[1] زمر - آیت نمبر ۳۳

خلیلا...... وقال صلی اللہ
علیہ وسلم: انا مدینۃ
الصدق وابوبکر بابھا وقال
علیہ السلام: من احب ابا
بکر فقد اقام الدین،

اپنی اُمت میں سے کسی کو دوست
اختیار کرتا تو ابوبکر ہی کو اختیار
کرتا، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے: میں صدق کا شہر
ہوں، اور ابوبکرؓ اس کے دروازے
ہیں، فرمایا حضور علیہ السلام نے:
جس نے ابوبکر سے محبت کی، اُس نے
دین کو قائم کیا،

حضرت عمرؓ کے لئے اس طرح فرمایا گیا ہے،[1]

ذکر امیر المومنین ابی حفص
عمر بن الخطاب المذکور
بافضل الخطاب، الحاوی
للثواب، الماحی العقاب
الذی فرق بین الحق والباطل
والقتیل والقاتل، الذی
انزل اللہ تعالٰی فی شانہ
یا ایھا النبی حسبک اللہ[2]
ومن اتبعک من المومنین

ذکر امیر المومنین ابوحفص عمرؓ بن
خطاب کا، جن کا ذکر افضل الخطاب سے
ہوا ہے، ثواب کے جمع کرنیوالے برائی کے ختم کرنے والے
وہ ذات جن کی وجہ سے حق و باطل
قتیل و قاتل میں امتیاز ہوتا ہے جن
کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی:
"یا ایھا النبی الآیہ" (اے نبی اللہ
اور مومنین میں وہ جنھوں نے آپ کی
پیروی کی، آپ کے لئے کافی ہیں) یعنی

[1] حدیقہ ص ۲۳۴، [2] قرآن سورۂ الانفال ۸ - آیت ۶۴؛

یعنی عمر رضی اللہ عنہ قال
النبی صلی اللہ علیہ وسلم:
عمر سراج اھل الجنۃ ولو کان
بعدی نبیا کان عمر وقال
علیہ السلام، ان الشیطان
لیفر من ظل عمر، من احب
عمر امن من الخطر من احب
عمر فقد اوضح الطریق وقال
انا مدینۃ العدل وعمر بابھا،

عمر، فرمایا، حضور علیہ السلام نے: عمر
اہلِ جنت کے چراغ ہیں، اگر میرے
بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے، اور فرمایا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطان
عمر کے سایے سے بھاگتا ہے جس نے عمرؓ
سے محبت کی، وہ خطرے سے محفوظ رہا
جس نے عمر کو عزیز رکھا، اس پر سارے
راستے روشن ہو گئے، اور فرمایا حضور
علیہ السلام نے: میں عدل کا شہر
ہوں، اور عمر اُس کے دروازے ہیں،

حضرت عثمانؓ کی مدح اس طرح شروع ہوتی ہے:۔[1]

ذکر الشھید القتیل المظلوم
ابی بکر عثمان بن عفان ذی
النورین المکرم فی المنزلین
ختن رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم باثنین ام کلثوم ورقیہ
المبارکتین الکریمتین جامع
القرآن الشاھد یوم التقی

بیان شہید قتیل مظلوم، ابو بکر عثمان
ابن عفان کا جو دونوں منزلوں (دنیا
و آخرت) میں مکرم ہیں جن سے حضور
علیہ السلام نے اپنی دو محترم و مکرم بیٹیاں
اُمّ کلثومؓ و رقیہؓ کا نکاح کر کے اُن کو
داماد بنایا، وہ جامع قرآن اور اس
دن کے شاہد ہیں جب دن جماعتیں ملیں گی

۱؎ حدیقہ ص ۲۳۹،

الجمعان، الذی انزل اللہ
سبحانہ وتعالی فی شانہ[1]:
أمّن ھو قانت آناء اللیل
ساجداً وقائماً یحذر الآخرۃ
و یرجو رحمۃ ربہ، وقال
النبی صلی اللہ علیہ وسلم
فی حقہ: عین الایمان عثمان
بن عفان مجھز جیش العسرۃ
وقال ایضاً صلوات اللہ و
سلامہ علیہ حکایۃ عن
اللہ تعالی: استحییت من
عثمان بن عفان، وقال
الحیاء من الایمان وعثمان
عین الحیاء وقال علیہ
السلام: انا مدینۃ الحیاء
وعثمان بابھا،

وہ ذات جن کی شان میں اللہ تعالیٰ
نے یہ آیت نازل فرمائی: امن ھو
قانت الآیۃ بھلا جو شخص، وقتِ
شب میں سجدہ و قیام (یعنی نماز کی
حالت میں عبادت) کر رہا ہو، آخرت
سے ڈر رہا ہو، اور اپنے پروردگار
کی رحمت کی امید کر رہا ہو) اور
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت
عثمانؓ کے حق میں فرمایا، عثمان بن
عفان عین ایمان ہیں جنھوں نے
تنگی میں فوج کے لئے ساز و سامان تیار
کر رکھا ہے، اور حضور نے اللہ کی طرف
منسوب کر کے فرمایا، عثمان بن عفان
سے میں حیا کرتا ہوں، اور حضور علیہ السلام
نے فرمایا، حیا ایمان سے ہے اور
عثمان عین حیا ہیں، اور حضور نے مزید
فرمایا، میں حیا کا شہر ہوں، اور عثمان
اُس کے دروازے ہیں،

۱؎ قرآن سورہ ۳۹ - آیت ۹ -

حضرت علیؓ کا بیان اس طرح شروع ہوتا ہے[1]،

ذکر زوج البتول وابن عمّ الرّسول ابی الحسن والحسین، المبا وذ الکرار، غیر الفرار، غالب الجیش الجرار، سیّد المہاجرین، والانصار، قال النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم: من احبّ علیا فقد استمسک بالعروۃ الوثقی، الذی انزل اللہ تعالیٰ "انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین آمنوا الذین یقیمون الصّلوٰۃ ویؤتون الزّکوٰۃ وھم راکعون" وقال اللہ تعالیٰ: ویطعمون الطّعام علیٰ حبّہ مسکیناً ویتیماً واسیراً" وقال علیہ السّلام: یا علی! انت منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ

حضرت فاطمۃ الزہرا (بتول)، کے شوہر، حضور کے چچازاد بھائی ابوالحسن والحسین، بہت تگ و دو کرنے والے میدان میں ڈٹے رہنے والے جنگجو، لشکر جرّار پر غالب، مہاجرین اور انصار کے سردار کا بیان حضور علیہ السّلام نے فرمایا، جس نے علی کو دوست رکھا، اس نے دین کے مضبوط دستے کو پکڑا، وہ ذات جس کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی "انما ولیکم اللہ الآیہ" (تمہارے دوست تو اللہ، اس کے رسول اور ایمان والے لوگ ہیں، جو اس حالت سے نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، کہ ان میں خشوع ہوتا ہے) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ویطعمون الطّعام الآیہ:

---

[1] حدیقہ ص ۲۴۴،

الا انّہ نبی لا نبی بعدی وقال صلّی اللہ علیہ وسلّم: اللّٰھمّ وال من والاہ وعاد من عاداہ، وانصر من نصرہ واخذل من خذلہ وقال: من کنت مولاہ فعلی مولاہ، ..... وقال النّبی علیہ السّلام: انا مدینۃ العلم وعلیؓ بابھا،

اور وہ لوگ محض خدا کی محبت سے غریب اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں) حضور علیہ السّلام نے فرمایا: اے علی تم مجھ سے ہو، جیسے ہارون موسیٰ سے تھے، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ نبی تھے (اور تم نبی نہیں) اس لئے کہ) میرے بعد کوئی نبی نہیں، رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ اس کو محبوب رکھ جو علی کو محبوب رکھے، اور اس کو دشمن رکھ جو علی کو دشمن رکھے، اس کی مدد کر، جس نے اُن کی مدد کی، اور جو اُن کو ذلیل کرے اس کو تو ذلیل کر، اور فرمایا، جس کا دوست میں ہوں، تو علی بھی اس کے دوست ہیں، اور نبی علیہ السّلام نے فرمایا، میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کے دروازے ہیں،

اگرچہ حدیقہ سنائی کے ان بیانات کے بعد حکیم سنائی کے تسنن، درحقیقت میں شبہ باقی نہیں رہ جاتا، پھر بھی مزید استدلال کے لئے دیوانِ سنائی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے،

دیوان میں خلفائے اربعہؓ کا ذکر بکثرت ہوا ہے، اور وہاں چاروں خلیفہ کا ذکر اسی ترتیب سے ہوا ہے جو اسلاف میں رائج تھی، ذیل میں بعض[1] اشعار پیش کیے جاتے ہیں:-

گفتم اے بوبکر با احمد چرا یکتا شدی — گفت ہر حرفے کہ ضعفی یافت آں مدغم بود
گفتم اے عمر تو دیدی بوالحکم پس چوں برید — گفت زمردکی سزاے دیدۂ ارقم بود
گفتم اے عثماں بنا گشتہ غوغا شدی — گفت خلخال عروس عاشقاں زاں دم بود
گفتم اے حیدر، منی از ساغر شیراں بخور — گفت فتح باز فتح زادۂ ملجم بود

اے چو عثمان چو حیدر شرم روی وزو درمند
وی چو بوبکر و چو عمر راست گوی و دادگر (صفحہ ۲۷۹)

صادقین بوبکر بود و قانتین فرخ عمرؓ
منفقین عثمان ، علی مستغفریں آمد ہم (ص ۲۶۳)

در از اصحاب پیغمبر، عتیق و عمر و عثمان
علی و سعد و سلمان و صہیب و خالد و مظعون (ص ۵۴۲)

درپی بوبکرؓ خواہی رفت بعد از مصطفیؐ — پاے بر دندان مار و دست بر دینار کو
در بگوے عمرؓ کو داد و کو مشک و دہار — یک دراعہ ہفدہ من دہ سال یک دستار کو
در در عثماں گرفتی شرم کو و حلم کو — دیدۂ روشن ز دین و سینۂ بیدار کو
در ہمی گوئی کہ ہستم چاکر شیر خداے — تن فداے تیغ و جاں در خدمت دادار کو

(ص ۵۷۳)

صادقی باید کہ چوں بوبکرؓ در صدق و ثواب — زخم مار و بیم دشمن از بن دندان کشد

[1] دیوان ص ۱۶۷،

یا نہ چوں عمرؓ کہ در اسلام بعد از مصطفیؐ — از عرب لشکر ز جیحوں سوے ترکستاں کشد
پارسائی کو کہ در محراب و مصحف بے گناہ — تا ز غوغا شورش شمشیر چوں عثماںؓ کشد
حیدری کرار کو کاندر مصاف از بہر دیں — در صف صفیں ستم از لشکر مرداں کشد

(ص ۴۵۹)

سنائی نے اپنے مکاتیب میں حضرت عمرؓ کی بے حد تعریف کی، مثلاً ایک خط خیام کے نام میں لکھتے ہیں:-

"جامہ وفا منہ تو داد عمرؓ بس احبک اللہ، مراد ازیں اصحاب و اطباب انت کہ چوں شرف جوہر نبوت از حراست عمرؓ مستغنی نبود، پس صدف دُرِ حکمت را از رعایت عمرے نیز استغنا نباشد، کہ کتاب و حکمت دو جوہر اند در یک طویلہ... ...چوں کتاب را چناں عمرؓ حاجت بود حکمت را نیز ہچوں تو عمرے حاجت باشد تا بیب عمران این دو ولایت عمراں باشد" (مکاتیب ص ۳۷)

ان مندرجات کے دقیق مطالعے کے بعد حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:-

(۱) سنائی اہل سنت والجماعت کے مسلک پر تھے، جو اشعار اوپر نقل ہو چکے ہیں، ان کے علاوہ چند اور شواہد قابل ذکر ہیں:-

سنی دیں دار شو تا زندہ مانی زانکہ ہست — ہر چہ جز دیں مردگی و ہر چہ جز سنت حزن

(ص ۴۸۹)

چار گوہر چار پایۂ عرش و شرع مصطفیؐ است — صدق و علم و شرم و مردی کار ایں ہر چار یار
چار یار مصطفیؐ را مقتدا دار و بداں — ملک او راہست نوبت پنج نوبت زن چہار

(ص ۱۹۱)

صد ہزاراں رنج بوبکرؓ از یکے ایں حرف بدُ　　　نوحؑ نہصد سال نوحہ کرد تا شد ہمچو نال

گردم بوبکرؓ خواہی بخشش یک نانت کو　　　در کمالِ نوح جوئی نوحہات کو نیم سال

(ص ۴۴۷)

بس نباشد قیمتِ گو ہر بر دنقمائے درد　　　در نیابد بخششِ بوبکرؓ حقِ مصطفاؐ (۴۲)

در حریم مصطفاؐ بوبکرؓ دا ار اندر خرام　　　تا بسیہ روے جفا بینی و خوشخو کی دفا

عشق را بینی علم بر کردہ اندر کوی صدق　　　عقل را بینی قلم بشکستہ در صد رضا

(ص ۴۴)

کار صدق و معنئ بوبکرؓ دارد و در جہاں　　　ور نہ در ہر کوے بوبکرؓ است و در ہر کوہ غار

(۲۱۴)

گر شکر بی زہر خواہی نار بے خر ما مباش　　　صدق بوبکرؓ بت باید خیمہ اندر غار زن

(ص ۳۸۲)

مصطفیؐ را یار بوبکرؓ ست اندر غار و بس　　　بولہب را باز بوجہل است یار و ہم نشیں

(ص ۵۵۲)

نام عمرؓ از عدل بلند است و گرنی　　　یک خانہ ندانم کہ در آں جا عمرے ہست

(ص ۱۰۰)

آہوے خود بیں افتد مرد باید چوں عمرؓ　　　چوں عمرؓ در زمیں نشیند بوالحسن باید سوار

(۲۲۵)

یا چوں عمرؓ بدرہ جہاں را قرار دہ　　　یا چوں علیؓ بہ تیغ فراواں حصار گیر

(۲۹۶)

چو عمر خطابؓ سر سنت و دینی　　　چوں حیدر کرارؓ در علم و سخائی (۲۰۶)

تا بروزِ عدل دار الحکمۃ از تاثیرِ عدل　　　ہمچو دار الملک انصافِ عمرؓ معمور باد

(۲۳۰)

(۲) سنائی کے نزدیک حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مراتبِ دینی کا منکر رافضی ہے،

در سرائے سریر مونس و یار　　　ثانی اثنین اذ ھما فی الغار

صورِ صدقیا متش خوانند　　　رافضی قدر او کجا داند

رافضی را بماندہ در گردن　　　جیک و مرگ جیک جاں کردن

بر براقی کہ مصطفیؐ پرورد　　　رافضی رافضی چہ داند کرد

(۳) سنائی کے نزدیک حضرت علیؓ کے مخالفین خوارج واجب القتل ہیں:

ہر کہ باشند خوارج و ملعون　　　واجب آنست کش بریزی خون

(۴) سنائی نے حدیقہ کے اشعار میں حضرت علیؓ اور اہل بیت اطہار سے کمال ارادت و عقیدت کا اظہار کیا ہے، مگر حضرت علیؓ کے نعتیہ قصیدہ میں جذباتِ ارادت و عقیدت میں وہ شدت نہیں جو حدیقہ میں پائی جاتی ہے، ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ بعض لوگوں نے سنائی کے مذہبی عقائد پر اعتراض کیا تھا، سنائی کے اشعار اس اعتراض کے جواب ہیں، اسی بنا پر ان میں ایک قسم کی شدت بھی ہے، اہل بیت سے کمالِ ارادت و اعتقاد کے نتیجے میں وہ آلِ ابی سفیان و آلِ مروان کی طعن و تشنیع کے بھی قائل تھے،

(۵) سنائی کے نزدیک امام اعظم یا امام شافعی پر طعن کرنے والے راہ دین سے بھٹکے ہوئے ہیں، دونوں میں سے کسی کی بھی پیروی راہِ حق ہے، وہ امام اعظم کے ساتھ اپنا حشر چاہتے ہیں

(۶) ان واضح نتائج کے روشنی میں وہ قصیدہ جو سلطان سنجر کے جواب میں ہے، اور جس میں

سنائی نے اپنے مذہبی موقف کی نشاندہی کی ہے، سنائی کے دیوان میں بے جوڑ معلوم ہوتا ہے، یہ قصیدہ بعض نسخوں میں من جملہ ان کے نسخۂ کلیاتِ کابل میں شامل نہیں ہے، ذیل میں اس قصیدے کے منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں،

کارِ عاقل نیست در دل مہرِ دل بر داشتن   جان نگیں مہرِ مہر شاخ بی بر داشتن
یوسفِ مصری نشستہ با تو اندر انجمن   زشت باشد چشم را در نقشِ آزر داشتن
احمد مرسل نشستہ، کے روا دارد خرد   دل اسیرِ سیرتِ بوجہل کافر داشتن
اے بدریائے ضلالت در گرفتار آمدہ   زیں برادر یک سخن باید باور داشتن
بحر پُر کشتی ست، لیکن جملہ در گردابِ خوف   بی سفینۂ نوح نتواں چشمِ معبر داشتن
گر نجاتِ دین و دل خواہی ہمی تا چند ازیں   خویشتن چوں دائرہ بی پا و بے سر داشتن
من سلامت خانۂ نوحِ نبی بنمایمت   تا توانی خویشتن را ایمن از شر داشتن
شو مدینۂ علم را در جوی و پس در وی خرام   تا کے آخر خویشتن چوں حلقہ بر در داشتن
چوں ہمی دانی کہ شہرِ علم را حیدرؓ در است   خوب نبود جز کہ حیدر میر و مہتر داشتن
کے روا باشد بناموس و حیل در راہِ دیں   دیو را بر مسند قاضی اکبر داشتن
از تو خود چوں می پسند د عقل نابینائے تو   پارگیں را قابلِ تسنیم و کوثر داشتن
مر مرا باری نکو ناید ز روئے اعتقاد   حقِ زہراؓ بردن و دینِ پیمبر داشتن
تا سلیماں وار باشد حیدر اندر صدرِ ملک   زشت باشد دیو را بر تارکِ افسر داشتن
چوں درختِ دین بباغِ شرع حیدرؓ در نشاند   باغبانی زشت باشد جز کہ حیدر داشتن
جز کتاب اللہ و عترت ز احمد مرسل نماند   یادگاری کاں تواں تا روزِ محشر داشتن
از گذشتِ مصطفائے مجتبےٰ جز مرتضیٰ   عالم را دین را نیارد کس معمر داشتن

از پسِ سلطان ملک شہ چوں ہمیداری روا   تاج و تختِ پادشاہی جز کہ سنجر داشتن
از پئے سلطان دیں پس چوں روا داری ہمی   جز علیؓ و عترتش محراب و منبر داشتن
ہشت بستاں را کجا ہرگز توانی یافتن   جز بحبِ حیدر و شبیر و شبر داشتن
گر ہمی مومن شماری خویشتن را بایدت   مہر زرِ جعفری بر دینِ جعفر داشتن

(دیوان چاپ مصفا، ۲۵ ببعد
چاپ مدرس رضوی ۷۶ ببعد)

سنائی نے آلِ ابی سفیان و آل مروان پر لعن طعن کی ہے، اگر ان اشعار میں روئے سخن اُن کی طرف ہوتا تو یہ اشعار سنائی کے دیوان میں بے جوڑ نہ تھے لیکن واضحاً روئے سخن خلفائے ثلاثہؓ کی طرف ہے، ان اشعار میں ان حضرات کو جس طرح نشانۂ ملامت بنایا گیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے لیکن جو اشعار پہلے نقل ہو چکے ہیں اُن میں خلفائے اربعہؓ کی محبت کو اصل دین بتایا گیا ہے، وہ خلفائے ثلاثہؓ سے بیزاری کو رفض کہتے ہیں، اور اُن کے نزدیک اہل "رفض" حق پر نہیں، اس طرح کے اشعار کی موجودگی میں قصیدۂ بالا کی نسبت نہ صرف مشکوک بلکہ غلط معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ ان اشعار میں جن خیالات کا اظہار ہوا ہے، وہ سنائی کے معتقدات کے خلاف ہیں، اور چونکہ یہ قصیدہ سنائی کے دیوان کے بعض نسخوں میں منجملہ نسخۂ کلیات کابل میں شامل نہیں، اس بنا پر اس کا انتساب یقیناً مشکوک ہے،

خلاصۂ کلام یہ کہ سنائی شروع سے آخر تک سُنی اور حنفی مسلک کے پیرو تھے، اہلِ بیت سے اُن کو بڑی عقیدت تھی، اسی بنا پر وہ آلِ ابوسفیان پر لعنت بھیجنے کے حق میں تھے، غالباً اسی وجہ سے اس دور کے سُنی علماء سے اُن کا اختلافِ ہوا، اس اختلافِ نظر کا عکس اُن کی مشہور کتاب حدیقہ میں ملتا ہے، یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت علیؓ کی نعت میں جو قصیدہ دیوان

میں شامل ہے، یا حضرات حسنینؓ کی مدح میں جو اشعار حدیقہ میں منقول ہیں، ان میں وہ جوش و خروش نہیں، جو ان اشعار میں ہے، جو حدیقہ میں حضرت علیؓ کی مدح میں شامل ہیں،

یہ عجیب بات ہے کہ فارسی کے کسی مشہور شاعر نے خلفائے ثلاثہؓ اور ائمہ فقہ خصوصاً امام اعظم اور امام شافعی کے ساتھ ایسی عقیدت کا اظہار لفظاً نہیں کیا ہے، جیسا سنائی کے یہاں ہے، لیکن اس کے باوجود ان کے عقیدۂ مذہبی کے بارے میں اختلاف عرصے سے چلا آرہا ہے، اور اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ آلِ ابوسفیان و آلِ مروان کو ملعون اور مطعون قرار دیتے تھے، اس سے ان کے بارہ میں غلط فہمی کے مواقع پیدا ہو گئے، اور لوگوں کو اس سے سوء ظن کا موقع ملا، لیکن حق بات یہی ہے کہ ان کا تسنن اور ان کی حنفیت ہر طرح کے شکوک سے پاک ہے،

شعر العجم جلد اوّل

فارسی شاعری کی تاریخ، جس میں شاعری کی ابتداء عہد بعہد کی ترقیوں اور اُن کے خصوصیات اور اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ ہر دور کے مشہور شعراء مثلاً رودکی، دقیقی، عنصری، دور غزنویہ کے مشہور شاعر فردوسی مصنف شاہنامہ، اسدی، طوسی، منوچہری، و امغانی، پانچویں اور چھٹی صدی کے شعراء میں حکیم سنائی، عمر خیام، انوری، نظامی، گنجوی کا مفصل تذکرہ، اور اُن کی شاعری پر تقریظ اور تنقید ہے، اس میں حکیم سنائی کی تمام تصنیفات خصوصاً دسکی، حدیقہ، اور سنائی کے کلام کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے،

از علامہ شبلی نعمانی — قیمت: ۱۵ روپے

"منیجر"

راجہ جے سنگھ کی رصد گاہیں

از جناب شبیر احمد خاں غوری ایم اے ال ال بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی (اتر پردیش)

(۳)

(جے سنگھ کا مسلم ماخذ)

غیاث الدین جمشید کاشی نے "زیج خاقانی" کے علاوہ ایک اور زیج "زیج التسہیلات" کے نام سے لکھی تھی، غالباً اسی کے عنوان کے اتباع میں ملا چند اکبر شاہی (مولانا چاند منجم ہمایونی) نے اپنی ہیئتی تصنیف کا نام "تسہیلات" رکھا تھا۔

تسہیلات ملا چند اکبر شاہی کا حوالہ "زیج محمد شاہی" کے دیباچہ کے علاوہ تاریخ و تذکرہ کی متداول کتابوں میں نہیں ملتا، ویسے مولانا چاند عہد ہمایونی کے ایک مشہور منجم تھے، وہ ہمایوں کے بہت پایہ کے درباریوں میں تھے، چنانچہ جب بادشاہ شیر شاہ سے شکست کھا کر ایران بھاگے اور ملکہ حمیدہ بیگم کو جو اکبر کی ماں بننے والی تھیں قلعہ امرکوٹ میں چند وفادار جان نثار ساتھیوں کے ساتھ چھوڑا تو ان لوگوں میں مولانا چاند بھی تھے، جنھیں بادشاہ اس لئے چھوڑ گئے تھے کہ نومولود کی پیدائش کے وقت موجود رہیں، اور اس کا زائچہ مرتب کر کے بادشاہ کے پاس بھیجیں، ابوالفضل کہتا ہے:

"در وقت نہضت رایات نصرت اعتصام از حصار امرکوٹ مولانا چند منجم را کہ در معرفت اسطرلاب و تحقیق زیج و استخراج تقویم و تخریج احکام مہارتے عظیم و ممارستے تمام داشت، بجہت تشخیص زمان سعادت وقت ولادت ملازم درگاہ عفت مآب ساختہ بودند"[۱]

---

[۱] اکبر نامہ ج ۱ ص ۲۳.

مولانا چاند نے جو "زمانِ سعادت" نومولود کی ولادت کے لئے تشخیص کیا تھا حمیدہ بیگم کو اس سے پہلے ہی درد زہ شروع ہوگیا، مولانا چاند کو معلوم ہوا تو انھوں نے بڑے ادب سے کہلا بھیجا کہ ملکہ عالیہ جس طرح بھی ہو سکے تکلیف کو ضبط کرلیں اور ابھی ولادت نہ ہونے دیں، کیونکہ ابھی نحوست کا اندیشہ ہے، لیکن حسنِ اتفاق سے ملکہ کو اسی وقت نیند آگئی اور اس وقت بیدار ہوئیں جو مولانا چاند نے ولادت کے لئے تشخیص کیا تھا، اس طرح بادشاہ اکبر کی ولادت اسی ساعت سعید میں ہوئی، اس کے بعد انھوں نے نومولود کا زائچہ بنا کر بادشاہ کو لکھا کہ ہیئتی حسابات سے طالع سعادت سنبلہ ہے۔[1]

فاضل مصنف نے "اکبر نامہ" کی متعلقہ عبارت کا انگریزی ترجمہ نقل کیا ہے جس سے سیدھی سادی بات چیستاں بن کر رہ گئی ہے۔

ملا فرید شاہجہانی (زیجِ شاہجہانی) کا ترک ذکر فاضل مصنف (جی۔ آر۔ کے) کی انتہائی افسوسناک فروگذاشت ہے، راجہ جے سنگھ "زیج محمد شاہی" کے دیباچہ میں غیر مبہم الفاظ کے اندر ملا فرید شاہجہانی کی ہیئتی تصنیف "زیج شاہجہانی" سے استفادہ کا معترف ہے۔

"زیجہائے متعارف مثل زیج جدید سعید گورگانی خاقانی و تسہیلات ملا چند اکبر شاہی و ملا فرید شاہجہانی..."[2]

مسلم ہندوستان کی ہیئتی تاریخ میں ملا فرید منجم شاہجہانی کی سرگرمیاں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کی "زیج شاہجہانی" (پورا نام کارنامۂ صاحبقرانی زیج شاہجہانی) مغل دور کے ہیئتی ادب کا گل سرسبد ہے، اور یہ باور کرنے کے لئے ناقابل تردید وجوہ ہیں کہ یہ کتاب راجہ جے سنگھ کے مطالعہ میں رہی تھی، اور وہ اس سے متاثر ہوا تھا (تفصیل آگے آرہی ہے) عہد شاہجہانی کا مشہور درباری مورخ محمد صالح کنبو "عمل صالح" میں ملا فرید کے تبحر علمی اور ریاضیاتی حذاقت کے بارے میں لکھتا ہے:

"ملا فرید منجم .... در تحصیل فن ریاضی باوجود مناسبت طبیعی و موافقت طالعی بتوفیق الٰہی

[1] اکبر نامہ ج ۱ ص ۱۸ و ۲۳۔ [2] زیج محمد شاہی ص ۱ ب۔

ریاضت تمام کشیدہ بود"[1]

اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ عبدالباقی نہاوندی نے "مآثر رحیمی" میں اس کے علم و فضل کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ وقت کے ایک مشہور علمی خاندان میں پیدا ہوئے، ریاضیات کی اعلیٰ تعلیم امیر فتح اللہ شیرازی سے حاصل کی جن کے فیضِ تلمذ نے جوہر ذاتی کو سونے سے کندن بنا دیا، نہاوندی نے لکھا ہے:[2]

"آخر الامر از جملۂ تلامذۂ زمان و وحید دوراں ارسطوئے ثانی و افلاطونِ یونانی شاہ فتح اللہ شیرازی گشت و ترقی تمام در خدمت ایشاں اور ادست داد، و در اندک زمانے از دانشمندانِ تبحر ایں فنون گردید و اہل ہندوستان بدانش و فضیلت او مقر و معترف گشتند و کارش بجائے رسید کہ اکثر علمائے متقدمین ریاضی و دانایان پیشیں وجود ش را در می یافتند بوجودش مفتخر گشتہ بشاگردیش مباہات می نمودند و متاخرین را خود در فضل و دانش او سخنے نیست۔"

علم ہیئت میں ان کی دو کتابیں مشہور ہیں "زیج شاہجہانی" اور "سراج الاستخراج"۔ اول الذکر کے بارے میں محمد صالح نے دوسرے سالِ جلوس کے واقعات میں لکھا ہے:

"اس انتہائی مبارک زمانہ کے واقعات میں سے ملا فرید منجم کا زیج شاہجہانی کو تصنیف کرنا ہے، انھوں نے ریاضی، ہیئت کے فنون کو سیکھنے میں بڑی کوشش و ریاضت کی ہے، انھوں نے بادشاہ شاہجہاں کے ایما سے آصف جاہ وزیر کی نگرانی میں اپنے بھائی ملا طیب اور دوسرے یونانی علم الہیئت نیز ہندو جوتش و دیا کے ماہرین کی مدد سے کتاب زیج شاہجہانی کو مرتب کیا تھا، اس سال (۱۰۳۷ھ مطابق ۱۶۲۷ء میں) بادشاہ کے سامنے (اس زیج شاہجہانی کو) پیش کیا اور بادشاہ نے اس کی اس کوشش کو بہت زیادہ سراہا، چونکہ اس کتاب کے اصول و ابواب بے شمار فوائد اور بے حساب منافع پر مشتمل ہیں، نیز اس میں ایسے قاعدے اور ضابطے ہیں جس سے مختلف

[1] عمل صالح ص ۱۳۶۱ [2] عبدالباقی نہاوندی: مآثر رحیمی ج ۱ ص ۱۔

ہیئتی اور نجومی مسائل بڑی آسانی سے حل ہو جاتے ہیں جن سے متاثر ہو کر اس فن کے ماہرین زیج الغ بیگی سے مستغنی ہو گئے ہیں اور اسی کتاب کی مدد سے تقویم اور جنتریوں کو تیار کرتے ہیں، لہٰذا بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ (فارسی نہ جاننے والے اور صرف) ہندی جاننے والے منجموں اور جوتشیوں کی تعلیم و تعلم اور آسانی سے سمجھ میں آنے کے لئے نجوم و ہیئت سے واقف علماء نے اس کتاب کا (عوامی) ہندی زبان میں ترجمہ کیا۔[1]

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، یہ باور کرنے کے لئے ناقابل تردید وجوہ ہیں کہ یہ کتاب راجہ جے سنگھ کے مطالعہ میں رہی تھی اور وہ اس سے متاثر ہوا تھا، راجہ نے اس کتاب "زیج شاہجہانی" کا ایک نہایت قابل اعتماد نسخہ حاصل کیا تھا جو یا تو مصنف کا دستخطی نسخہ ہے یا اس سے براہ راست منقول ہے، خوش قسمتی سے یہ کتاب دستبرد حوادث سے محفوظ رہ گئی اور آج بھی ریاستی لائبریری کا قابل فخر سرمایہ ہے، جسے نیشنل میوزیم دہلی نے مستعار لے لیا ہے،[2] اس کا سنہ کتابت حسب تصریح ۱۰۳۷ھ ہے، جب کہ بقول محمد صالح اس کا سنہ تصنیف بھی ۱۰۳۷ھ ہے، مگر کے (G. R. Kay) نے راجہ کے مسلم آخذوں میں اس کا نام نہیں لیا، حالانکہ خود راجہ نے اس کی صراحت کی تھی، چونکہ Flamstead کے ہیئتی جداول اس کی لائبریری میں ملے تھے اس لئے باوجود دیکھ راجہ نے اس کے بارے میں کوئی صراحت نہیں کی، کے نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ راجہ نے اس کا مطالعہ کیا تھا،[3] مگر "زیج شاہجہانی" کا یہ قدیم ترین اور بیش قیمت مخطوطہ بھی ریاستی لائبریری کے اندر ہنوز موجود ہے اور راجہ نے غیر مبہم الفاظ میں اس کے مطالعہ کرنے کی صراحت بھی کی ہے، مگر فاضل مصنف نے اسے درخور اعتنا نہ سمجھا، یا للعجب! خدا جانے یہ فروگذاشت خود فاضل مصنف نے کی ہے یا ہنٹر کے اتباع میں انھوں نے ایسا کیا۔

[1] محمد صالح کنبو: عمل صالح، وقائع سال دوم جلوس ص ۳۶۱
[2] Catalogue of National Mus P. 102,
[3] G. R. Kaye. P. 88,

اور پھر بار بار کہا گیا ہے کہ راجہ کی مرتبہ زیج محمد شاہی کو اگر بر بنائے ادب "زیج الغ بیگ" کا سرقہ نہ کہا جائے تب بھی مقدم الذکر کو موخر الذکر کا چربہ یا نظر ثانی کردہ ایڈیشن (Revised Edition) ضرور کہا جائے گا، فاضل مصنف نے تو صرف اتنا ہی کہا ہے:

"ان عوامل و موثرات کے باب میں ذرا سا بھی شک نہیں ہے جنھوں نے راجہ جے سنگھ کی ہیئتی سرگرمیوں کا رخ متعین کیا، یہ الغ بیگ جیسے مسلمان ہیئت دانوں کے اثرات تھے۔"[1]

اور ان کی تقلید میں جوزف نیڈھم نے لکھا ہے:

"راجہ اگرچہ ہندو تھا اور اس نے ہندو معاونین ہی کی مدد سے کاروبار رصد کو انجام دیا، مگر وہ کلیۃً اسلامی، عربی علم الہیئت کی روایات کا متبع تھا، اور اپنی مساعی کو الغ بیگ کی سرگرمیوں کا تسلسل سمجھتا تھا۔"[2]

لیکن سوال الغ بیگ جیسے مسلمان ہیئت دانوں کے "Influence" اور الغ بیگ کی سرگرمیوں کے "تسلسل" کی نوعیت کا ہے۔

سقوط بغداد کے بعد محقق طوسی نے دیگر علوم عقلیہ کی طرح علم الہیئت کی بھی تجدید کی، ان کی مرتب کردہ "زیج ایلخانی" نے بعد کی زیجوں کے لئے نمونۂ عمل کا کام دیا، "زیج ایلخانی" میں تمہید کے بعد چار مقالے ہیں: پہلا "تواریخ" (Calendar) پر، دوسرا حرکات کواکب و اوضاع ثوابت پر، تیسرا "معرفت اوقات و طوالع" پر اور چوتھا "اعمال نجومی" پر، کوئی دو سو سال بعد الغ بیگ نے بھی اپنی "زیج جدید گورگانی" میں اسی تقسیم کو ملحوظ رکھا، صرف پہلے اور دوسرے مقالہ کی ترتیب بدل دی، چنانچہ "زیج الغ بیگ" بھی چار مقالوں پر مشتمل ہے بترتیب ذیل:

[1] G.R.Kaye: P. 69
[2] Joseph Needham: Science and Civilization in China Vol. III. P. 300

پہلا مقالہ "معرفت تواریخ" میں، دوسرا مقالہ "معرفت طالع ہر وقت" میں، تیسرا مقالہ "روشِ سیارگان و مواضعِ ایشاں" میں، اور چوتھا مقالہ "بقیہ اعمال نجومی" میں۔

بعد میں "زیج الغ بیگ" ہی کی تقسیم و ترتیب کو ملا فرید منجم نے "زیج شاہجہانی" میں ملحوظ رکھا ہے، اس میں بھی چار مقالے ہیں: پہلا "معرفت تواریخ" میں۔ دوسرا "معرفت اوقات و طالع اوقات" میں، تیسرا "حرکت سیارات و اوضاع ثوابت" میں، اور چوتھا "نجوم" میں۔

اسی ہیئتی مواد کو جے سنگھ نے اسی تقسیم و ترتیب کے ساتھ "زیج محمد شاہی" میں اختیار کیا، چنانچہ اس کا بھی پہلا مقالہ "معرفت تاریخ" میں ہے، دوسرا مقالہ "معرفت طالع ہر وقت" میں، اور تیسرا مقالہ "روشِ سیارگان و مواضع اینہا، و طول و عرض و آنچہ ملائم آنست" میں۔

مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نسخہ "زیج محمد شاہی" میں صرف یہی تین مقالے ہیں، اور جس نسخہ سے یہ منقول ہے اس کے بارے میں بھی کاتب نے صراحت کی ہے کہ اس میں اسی قدر مواد تھا اور جلد بھی باقاعدہ بندھی ہوئی تھی[1]۔ معلوم نہیں اس نسخے ہی میں کوئی چوتھا مقالہ نہیں تھا، یا راجہ جے سنگھ ہی نے یہ مقالہ نہیں لکھا، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ سابقہ زیجوں کا چوتھا مقالہ بھی علم الہیئت سے تعلق نہیں رکھتا۔

لیکن غیر معمولی مماثلت "زیج الغ بیگ" اور "زیج محمد شاہی" میں ہے، مثلاً دونوں کے دوسرے مقالہ کا موضوع "معرفت اوقات و طوالع" ہے، اول الذکر میں بائیس اور ثانی الذکر میں اکیس باب ہیں، اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ "زیج الغ بیگ" کے دوسرے مقالہ کا پہلا باب "تعدیل ما بین السطرین" (Interpolation) پر ہے، مگر جے سنگھ نے اپنی زیج کے دوسرے مقالہ کے

---

[1] زیج محمد شاہی ص ۸۲ ب۔ "در کتاب شرف خاں صاحب ہمیں قدر مقدار اوراق و جد اول بودند، و زیادہ ازیں نبود، و کتاب ایشاں مجلد بود، یعنی تمام کتاب اصل زیج محمد شاہی ہمیں قدر است۔

پہلے باب کے آخر میں اس بحث کا ماحصل لکھ دیا ہے، نیز "زیج الغ بیگ" کا انیسواں باب سمت قبلہ کی دریافت پر ہے (باب نوزدہم در معرفت سمت قبلہ و انحراف او[1]) مگر راجہ کے تعصب اور اسلام بیزاری نے اسے اپنی کتاب سے ساقط کر دیا اور مقالہ دوم کے آخر میں ایک اور باب کا اضافہ کر دیا۔

اس صوری مشابہت سے زیادہ مماثلت مواد کی ہے، ضمائر کے اختلاف سے قطع نظر دونوں زیجوں کے اکثر ابواب میں مواد اس درجہ یکساں ہے کہ "زیج محمد شاہی" کو "زیج الغ بیگ" کا سرقہ نہیں تو چربہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا، اس کی تفصیل تو موجب تطویل ہوگی، وضاحت کے لئے صرف ایک مثال دی جاتی ہے:

"زیج الغ بیگ : مقالہ دوم[2]

باب ہفتم در مطالع خط استواء

و آنرا مطالع فلک مستقیم نیز گویند

جیب تمام قوسے را کہ میان جزو مفروض و نقطۂ اعتدال اقرب باشد، بر جیب تمام میل آں جزو منحط قسمت کنیم، جیب تمام مطالع آں جزو حاصل آید، و بوجہے دیگر جیب قوس مذکور را در جیب تمام میل کلی ضرب کنیم و بر جیب تمام میل نقطۂ مفروض قسمت کنیم حاصل جیب مطالع باشد

زیج محمد شاہی : مقالہ دوم[3]

باب ششم در مطالع خط استواء

و آنرا مطالع مطالع فلک مستقیم نیز گویند

جیب تمام قوسے را کہ میان جزو مفروض و نقطۂ اعتدال اقرب باشد بر جیب تمام میل آں جزو منحط قسمت کنیم، جیب تمام مطالع آں جزو حاصل آید، و بوجہے دیگر جیب قوس مذکور واحد جیب تمام میل کلی ضرب کنیم و حاصل را بر جیب تمام میل نقطۂ مفروضہ قسمت کنیم، حاصل جیب مطالع باشد"

---

[1] زیج الغ بیگ ورق ۲۱ ظ [2] زیج الغ بیگ ص ۱۵ ب [3] زیج محمد شاہی ص ۷ ظ۔

مزید تفصیل موجب تطویل ہوگی۔

اس کے بعد یہ سوال کسی مزید وضاحت کا مقتضی نہیں رہتا کہ یہ مماثلت جو اتفاقی نہیں ہے "اثرات" کی مصداق ہے یا "تسلسل" کی، یا "نظرِ ثانی" کی، یا "چربہ" کی، یا کسی اور چیز کی۔

لیکن جیسا کہ سابق میں مذکور ہو چکا ہے (معارف نومبر ۱۹۷۸ء ص ۳۷۲) ہرچند کہ "راجہ جے سنگھ نے نظری علم الہیئت میں کوئی اضافہ نہیں کیا، تاہم عملی علم الہیئت میں اس کی مساعیِ علمیہ کا بہت بڑا مقام ہے" چنانچہ فاضل مصنف لکھتا ہے:

"یہ بات کہ جے سنگھ نے کوئی نئی ہیئتی دریافت نہیں کی، اس کی سرگرمیوں کی قدر و قیمت کا صحیح اور منصفانہ معیار نہیں ہے، کیونکہ انتہائی قیمتی ہیئتی سرگرمیوں کا بہت بڑا حصہ نئی دریافتوں سے متعلق نہیں ہوتا، اس کا مصرح مقصد تقویم کی اصلاح، گرہنوں کی صحیح پیشین گوئی اور اسی طرح کے دوسرے امور سے متعلق تھا، اور یہ ایسے کام ہیں جن میں انتہائی تاب فرسا محنت درکار ہوتی ہے، پھر بھی عموماً کوئی نمایاں کامیابی نظر نہیں آتی"[1]

اس سے بھی کہیں زیادہ اس کی ہیئتی سرگرمیوں کا بڑا مقصد ارصاد اور آلاتِ رصدیہ کی اصلاح واختراع اور اتقان و تدقیق تھا، اور اس باب میں اس نے دیرپا یادگاریں چھوڑی ہیں، بلکہ راجہ جے سنگھ کو یہ امتیازی شرف حاصل ہے کہ آج جب کہ مشرق میں کسی قدیم رصدگاہ کے آثار ڈھونڈے نہیں ملتے، صرف اسی کی قائم کردہ رصدگاہیں (کم از کم دہلی، جے پور اور بنارس میں) ہنوز برقرار ہیں اور زبانِ حال سے اپنے بانی کے کمال کی شہادت دے رہی ہیں، اور اگر اس کے ساتھ ہم یہ بھی یاد رکھیں کہ فاضل راجہ نے یہ عظیم عمارتیں بغیر کسی سابق نمونہ کے محض اپنے پیش رو (مسلمان) ہیئت دانوں کی کتابوں کے مطالعہ یا اپنے خداداد ملکۂ ایجاد و اختراع کی مدد سے تعمیر کی تھیں تو ہمیں اسے عباقرۂ روزگار کی صف میں جگہ

[1] G. R. Kaye, P. 86,

دینے میں بخل نہیں کرنا چاہئے۔

اس باب میں فاضل راجہ کی ان اختراعی و تعمیری مساعی کا اجمالی خاکہ سابق میں مذکور ہو چکا ہے (معارف نومبر ۱۹۷۸ء ص ۳۷۲) لیکن اس سلسلہ میں اہم سوال یہ ہے کہ آیا وہ اپنی ان اختراعی و تعمیری مساعی میں اپنے پیشرؤوں کا رہین منت تھا یا نہیں؟ اور اگر تھا تو کس حد تک؟

فاضل مصنف نے جسے رصدگاہوں کی تعمیر کی تاریخ سے بڑی گہری واقفیت ہے، اس کا جواب اثبات میں دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ غیر مبہم الفاظ میں اس کے مآخذ کی نشاندہی بھی کی ہے، وہ لکھتا ہے:

"عام طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جے سنگھ کے آلات (رصدیہ) ان پچھلے آلات (رصدیہ) کی یا تو بعینہٖ نقل تھے یا براہ راست اصلاح تھے جنھیں الغ بیگ یا اس کے پیشرؤوں نیز اس کے بعد آنے والے ہیئت دانوں نے استعمال کیا تھا"[1]

اس کے ساتھ وہ بطور دفع دخل مقدر ایک ممکنہ غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیتا ہے:

"جن آلات رصدیہ کا ذکر (قدیم) ہندو تصانیف میں کیا گیا ہے، ان میں اور جے سنگھ کے مخصوص آلات رصدیہ (سمراٹ جنتر، رام جنتر، جے پرکاش) میں کوئی امر مشترک نہیں ہے"[2]

ساتھ ہی ساتھ وہ غیر مبہم الفاظ میں اعلان کرتا ہے کہ جے سنگھ نے اپنے اختراع کردہ مخصوص آلاتِ رصدیہ کا بنیادی تصور مسلمان ہیئت دانوں سے اخذ کیا تھا:

"اس (راجہ جے سنگھ) کے حجری آلات رصدیہ ان تصورات کے زیر اثر تیار کئے گئے ہیں، جو اس نے (سابق) مسلمان ہیئت دانوں سے اخذ کئے تھے"[3]

اس اجمال کی تفصیل حسب ذیل ہے:

آلاتِ رصدیہ کی کئی قسمیں ہیں، چنانچہ مصنف "جامع بہادر خانی" نے لکھا ہے:

[1] G.R.Kaye P. 86 [2] G.R.Kaye.P. 89 [3] G.R.Kaye.P. 89

"واضح باد کہ آلات رصدی دو گونہ است:

یکے آنکہ صغیر الحجم بود و نصف قطرش زیادہ از ذراع نباشد و از روئے آں اعمالِ رصدی بوقتے از اوقاتِ حال بالتقریب معلوم کنند، اما ضبط حرکات کواکب برائے زمانہ مدید مستقبل از روئے آں متعذر باشد و مشہور ترین ہمچو آلات کرۂ مصنوعہ و اسطرلاب و ربع مجیب است۔

دوم آنکہ کبیر الحجم باشد و محیطش باجزائے ما دون درجہ تقسیم پذیرد، و از روئے رصد اوقاتِ حال بتدقیق و ہم ضبط حرکات و تعیین اوضاع کواکب بزمانہ مستقبلہ مفروضہ تواں کرد، و مشہور ترین ہمچو آلات ذات الحلقتین، لبنہ، سدس فخری، حلقۂ اعتدالی، حلقۂ شاملہ افقی، ذات الحلق، ذات الشعبتین، ذات السمتین است[1]"

لیکن ان دو قسموں کے علاوہ ایک تیسری قسم اور بھی ہوا کرتی تھی، جنھیں (Masonary) یا حجری و جصی (Instruments of Stone and Lime) کہتے ہیں، ان کی اختراع کا موجب اہلِ ہیئت کا دھات کے بنے ہوئے آلات سے بے اطمینانی و مایوسی تھا، کیونکہ ان (دھات کے بنے ہوئے آلات) کی مدد سے مطلوبہ صحت و تدقیق حاصل نہیں ہو سکتی تھی، لہٰذا وہ مجبور ہوئے کہ غیر معمولی طور پر بڑے آلات بنائیں، المقریزی نے ایک ہیئت داں کا قول نقل کیا ہے کہ کاش وہ اتنا بڑا دائرہ بنا سکتا جس کا ایک سرا اہرام پر اور دوسرا جبل مقطم پر ہوتا، کیونکہ جتنا بڑا آلۂ رصدیہ ہوتا ہے اتنے ہی صحیح اور دقیق مشاہدات حاصل ہوتے ہیں، چنانچہ ابوالوفاء البوزجانی کے "ربع تام" (Quadrant) کا نصف قطر ۲۲ فٹ تھا، حامد بن خضر الخجندی کے "سدس فخری" کا نصف قطر ۵۰ فٹ تھا، غالباً ایسے ہی عظیم القطر آلات رصد گاہ مراغہ میں ہوں گے اور انہی کے انداز پر الغ بیگ کی رصد گاہ سمرقند کے آلات بنائے گئے تھے، موخر الذکر کے ربع (Quadrant) کا نصف قطر بقول لی بان اتنا بڑا تھا جتنا کہ جامع ایا صوفیا کے

[1] مولانا غلام حسین جون پوری: جامع بہادر خانی ص ۴۰۸۔

گنبد کی اونچائی ہے[1] یعنی کوئی ایک سو اسی فٹ، ممکن ہے یہ بات کچھ مستبعد نظر آئے، مگر حال ہی میں رصد گاہ سمرقند کی کھدائی ہوئی ہے، اس میں اس "ربع" کا جو حصہ دستیاب ہو سکا اس کے فوٹو ایک ازبک دانشمند قاری نیازوف نے اپنی کتاب "Astronomicaeskaia Schkola Ulaigbeka" میں شائع کر دئے ہیں، ان فوٹوؤں سے لی بان کے قول کی تصدیق ہو جاتی ہے[2]۔

رصد گاہ الغ بیگ ہی کے انداز پر یورپی نشأۃ ثانیہ کے ہیئت دانوں نے اپنی اپنی رصد گاہیں بنائیں، اس کی مثال ٹیکو براہے (Tyclo Brake) کی بنائی ہوئی رصد گاہوں میں دیکھی جا سکتی ہے، بالخصوص اس کی رصد گاہ اوگس برگ (Augsburg) کا "ربع عظیم" (Quarant) نیز بعد کی رصد گاہ (Uraniborg) کا Mural Quadrant[3].

پھر رصد گاہ مراغہ میں آلات رصدیہ کی ساخت کا جو انداز اختیار کیا گیا تھا اس میں وہی رجحان کارفرما رہا ہوگا جو سابق کے مسلمان ہیئت دانوں ابوالوفاء البوزجانی، حامد الخجندی وغیرہ کا پسندیدہ مشغلہ تھا، اور جو بعد میں رصد گاہ الغ بیگ میں بھی جاری رہا، یہاں (مراغہ میں) بھی عظیم آلات رصدیہ بنائے گئے ہوں گے اور انہی آلات کے نمونے ہلاکو یا اس کے جانشین نے منگول شاہنشاہ قبلائی خاں کے پاس جمال الدین نام کے ایک ہیئت داں کے ہاتھ چین بھیجے ہوں گے[4]، لہٰذا یہ رجحان (یعنی عظیم آلات رصدیہ کا استعمال) وہاں بھی اثر انداز ہوا، جیسے وہاں کی بعض قدیم رصد گاہوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

بہرحال چونکہ راجہ جے سنگھ نے رصد گاہ دہلی مسلمان ہیئت دانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کے مطالعے کے بعد قائم کی تھی، لہٰذا اس نے بھی کبیر الحجم آلات کی تیاری کی طرف خصوصی، کی۔

ویسے عمارتی (Masonary) آلات رصدیہ کا رواج اسلامی رصد گاہوں میں عام تھا

[1] گستاؤلی بان: تمدن عرب، ص ۴۲۲ [2] Needham Vol III, P. 296 and fool-ndhi
[3] Needham Vol III, P. 296 [4] ایضاً: P. 372

غور کی رصدگاہ (زمانہ پانچویں صدی ہجری کا وسط) اور مراغہ کی رصدگاہ (۶۵۸ تا ۶۷۳ھ) میں ایسے عمارتی آلات کی تفصیل تواریخ میں محفوظ ہے، غور کی رصدگاہ اس خاندان کے ایک حکمراں امیر عباس نے جو سلطان ابراہیم غزنوی کا ہمعصر تھا، تعمیر کرائی تھی، اس کا ذکر منہاج سراج نے "طبقات ناصری" میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"و در پایۂ آں کوہ بر بالائے تلے قصر بلند بنا فرمود بدوازدہ برج، و در ہر برجے بصورت برجے از فلک، سی دریچہ نہادہ، شش برج شرقی و شمالی و شش برج غربی و جنوبی، و بر ہر برجے صورت، برجے از فلک بنگاشت و وضع آں چناں کرد کہ ہر روز خورشید از یک دریچہ ... مطلع آں بودے در تافتے، چنانچہ او را معلوم بودے کہ آں روز آفتاب در کدام درجہ از کدام برج است[1]۔"

رصدگاہ سے کوئی دو سو سال بعد مراغہ کی رصدگاہ تیار ہوئی، اس کی کیفیت تعمیر میں صاحب "حبیب السیر" نے لکھا ہے:

"خواجہ نصیر الدین ...... در طرف شمالی مراغہ بر زیر پشتہ رفیع بہ بنائے رصد خانہ اشتغال فرمودہ، مشتمل بر تمامین اشکال افلاک .... در بروج دوازدہ گانہ. و آں رصد بر وجہے ساختہ و پرداختہ شد کہ ہر صباح پرتو نیر اعظم از نقبہ قبۂ بالا بر سطح عقبہ می افتاد و درج و دقائق حرکت وسط آفتاب ...... از آنجا معلوم می گشت[2]۔"

سلسلۂ کلام جاری رکھنے سے پیشتر دو باتیں کہنا ضروری ہیں:

۱. رصدگاہ غور دنیائے اسلام کے ایک انتہائی غیر معروف گوشہ میں تعمیر ہوئی تھی، اس لئے

---

[1] منہاج سراج جوزجانی: طبقات ناصری ص ۳۳۱ (مرتبہ ڈاکٹر عبدالحئی حبیبی، نشر کردہ انجمن تاریخ افغانستان کابل ۱۳۴۳ھ
[2] حبیب السیر ج ۳ جزو اول، ص ۵۹۔

اس بات کے فرض کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے کہ اس کی تقلید میں خواجہ نصیر الدین طوسی نے مراغہ میں رصدگاہ قائم کی۔

۲. صاحب "حبیب السیر" نے ممکن ہے اپنی تاریخ کی تدوین میں "طبقات ناصری" سے استفادہ کیا ہو، لیکن رصدگاہ مراغہ کی کیفیت تعمیر کے قلم بند کرنے میں "طبقات ناصری" کی عبارت متعلقہ کا سرقہ ناقابل تصور ہے، بالخصوص جب کہ اس کے قیام و تیاری اور کیفیت ارصاد کے متعلق نہ صرف بعد کے ماہرین خصوصی کے کتب و رسائل موجود تھے، بلکہ شاید اس رصدگاہ کے کارکنوں کی یادداشتیں (مثلاً مؤید الدین عرضی دمشقی کا رسالہ فی کیفیۃ الارصاد .... (نخ) بھی موجود تھیں۔

لہٰذا یہ نتیجہ نکالے بغیر چارہ نہیں کہ عمارتی آلات رصد (Masonsary instruments) کا عام دستور تھا اور سمراٹ جنتر وغیرہ کی تعمیر راجہ جے سنگھ کی جدت اختراع کی مرہون منت نہیں ہے، بلکہ مسلمان ہیئت دانوں نے اس موضوع (آلات رصد کی تیاری) پر جو کتابیں لکھی تھیں، ان کے مطالعہ کا نتیجہ ہے، ہاں یہ ممکن ہے کہ راجہ کی جدت پسند طبیعت نے اس میں جزوی تبدیلیاں کی ہوں، مزید تفصیل سر دست ناممکن ہے، کیونکہ ان کتابوں کے محتویات ہنوز منظر عام پر نہیں آئے، خود فاضل مصنف (جی. آر. کاے) نے لکھا ہے:

"عربوں کے بنائے ہوئے کبیر الحجم آلات (رصدیہ) کا تفصیلی بیان نہیں ملتا[1]۔"

ویسے مسلم ہیئت دانوں نے آلات رصدیہ کے موضوع پر وافر سرمایہ چھوڑا ہے، اس میں سے چند اہم تصانیف ہندوستان اور یورپ کی لائبریریوں میں ہنوز موجود ہیں، مثلاً:

(۱) رسالہ آلات رصدیہ (رضا لائبریری رام پور) (۲) رسالہ فی صنعۃ الآلات الرصدیہ (آصفیہ حیدر آباد، حال سنٹرل لائبریری حیدر آباد (۳) رسالۃ الغازانیہ

---

[1] G. R. Kaye. p 86

فی الآلات الرصدیہ (آصفیہ) (۴) مختصر بیان الرصد (آصفیہ) (۵) شرح رسالہ آلات رصدیہ (آصفیہ) (۶) کتاب تعلیم آلات رصد (برٹش میوزیم) (۷) رسالہ فی کیفیۃ الارصاد... الخ (پیرس درایا صوفیا)

مگر اس عاجز کی محرومی قسمت کہ باوجود کوششِ فراواں ہنوز ان کی زیارت سے محروم ہے، فالی اللہ المشتکی۔

بہرحال ان ثانوی ماخذوں کی مدد سے فاضل مصنف (جی۔ آر۔ کاے) نے راجہ جے سنگھ کے اپنے اختراع کئے ہوئے آلاتِ رصدیہ کے ماخذ اور ان سے راجہ کے استفادے کی کیفیت بتائی ہے:

ان میں سب سے اہم سمراٹھ جنتر ہے، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، یہ آلاتِ رصدیہ کا شاہنشاہ و سرتاج ہے، جی۔ آر۔ کاے کے خیال میں اس کا ماخذ اولین بروسس Berorus کا نصف کرہ ہے۔[1]

"The Samrat Yantra might be Considered as a Section in th Plane of the equator of the hemisphere of Berosus"

اسی ساخت کی بنا پر نہ صرف قرون وسطیٰ میں بلکہ عہد حاضر کی ابتدائی صدیوں میں بھی بہت سے "صفائح" (Dails) تیار کئے گئے، برٹش میوزیم میں سترہویں اور اٹھارویں صدی میں بنے ہوئے بہت سے "ڈائل" موجود ہیں، جو اسی اصول پر تیار کئے گئے تھے جس پر "سمراٹھ جنتر" بنا ہے۔

۱؎ G.R. Kaye P. 87

"سمراٹھ جنتر" ساعات مستویہ یا ساعات معتدلہ کی پیمائش کا آلہ ہے۔

ساعات مستویہ کے ارتقاء کی تفصیل بڑی دلچسپ ہے، اور فاضل مصنف نے اسے ذکر کیا ہے،[1] قدیم آلات میں طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کا وقت بارہ برابر حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا، ہر حصہ ساعت یا گھڑی کہلاتا تھا، مگر سال کی مختلف فصلوں میں اس "ساعت" یا گھڑی کی مدت مختلف ہوتی تھی، کم سے کم سب سے چھوٹے دن کا بارہواں حصہ اور زیادہ سے زیادہ سب سے بڑے دن کا بارہواں حصہ، اسی نابرابری کی وجہ سے انھیں ساعات معوجہ یا "ساعات زمانیہ" کہتے تھے، یورپ میں (Temporal House) ظاہر ہے ان میں اوسط اُس دن کی ساعت ہوگی جبکہ آفتاب نقطۂ اعتدال پر ہوتا ہے،
جب وقت پیمائی کے لئے میکانکی طریقے ظہور میں آئے، مثلاً "ریت گھڑی" (Sandglass) "پن گھڑی" وغیرہ تو آفتابی گھڑیوں کی پیمائش کے لئے بھی "ساعات معتدلہ" معیار قرار پائیں، فرانسیسی ہیئت داں ڈی المبرٹ (۳ Delambre) کہتا ہے کہ ساعات معتدلہ کی ابتداء مراکش کے ہیئت داں و میقات ساز عبدالحسن (صحیح نام ابو علی الحسن بن علی بن عمر المراکشی) نے کی۔

لیکن المراکشی نے "سیر اظلال" کے لئے رائج الوقت افقی سطح (Horizontal - Plane) کو استعمال کیا تھا، مگر جے سنگھ کے بنائے ہوئے آلہ میں ایک ترچھے نومون — (Inclined gnamon) کا سایہ ایک مدور قوس پر پڑتا ہے جو دائرۂ معدل النہار کی سطح میں واقع ہے۔

جی۔ آر۔ کاے دوسرے آلہ "جے پرکاش" کے بارے میں لکھتا ہے،[2] جے پرکاش عملاً بروسس (Brosus) کا نصف کرہ ہی ہے، صرف اس میں تھوڑی سی جدت کی گئی ہے، یہ اجزاء میں منقسم (gradutel) ہے اور غالباً

۱؎ G.R. Kaye, P. 87 ۲؎ ایضاً: ص ۸۶

قدیم مسلمان ہیئت دانوں کے بنائے ہوئے اس آلہ پر مبنی ہے جو "المساطرہ" کہلاتا تھا، اور جس کا ذکر تفصیلی طور پر آلات رصدیہ پہ لکھنے والے مصنفین نے کیا ہے۔ ان میں سے بہت سی کتابیں فرانسیسی مستشرق سدیو کی دسترس میں تھیں اور انہی کی مدد سے اس نے اپنی کتاب مرتب کی تھی ("Memoire Sur les instruments astronomique des Arabes")

ان کتابوں میں سے بعض راجہ جے سنگھ کے بھی پیش نظر رہی ہیں جن کا وہ زیج محمد شاہی کے دیباچہ میں حوالہ دیتا ہے:

"چندے از آلات رصدی مانند آنکہ در سمر قند ساختہ بودند از روئے کتب اسلامیاں درانجا ہم ساخت" [1]

خوش قسمتی سے ان میں ایک اہم کتاب نظام الدین عبد العلی برجندی کی "رسالہ فی آلات الرصد" ہے۔

دو اور آلے جن کی اختراع کو راجہ جے سنگھ کی عبقریت کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے "رام جنتر" اور "دگا ساینتر" ہیں، مگر جی۔ آر۔ کاے کا خیال ہے کہ یہ مسلمانوں کے وضع کردہ دائرۃ السموت (Azimuth) نیز دائرۃ السموت اور دائرۃ الارتفاع کے مرکب آلہ (Combined Azimuth and Altitude instruments) سے ماخوذ ہیں جنہیں اصل کے مقابلہ میں بہت بڑا اور دھات کے بجائے چونے پتھر سے بنایا گیا ہے۔ [2]

ختم مقال سے پیشتر فاضل مصنف کے ایک دلچسپ انکشاف کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے، وہ لکھتا ہے:

"سائنس کی تاریخ میں ایک عجیب نکتہ قابل غور ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو براہ راست زاویائی پیمائش سے کتراتے تھے ان کی ریاضیاتی تصانیف میں زاویوں سے متعلق کوئی قاعدہ یا شکل ثبات نہیں ملتی Indian Mathematics

دتی کہتا ہے (ص ۲۵۹) ہندوؤں نے زاویہ جیبی ماتوس اور بنیادی مقدار کے لئے کا لفظ بیرونی ملک (یونان) کے Vrwia سے حاصل کیا، ممکن ہے یہ دعوی عجیب اور مستبعد نظر آئے اس لئے اس کی تائید میں ہم اس چونکا دینے والی حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرائیں گے کہ ہندو ریاضیات کے اس (ترقی یافتہ اور طلائی) دور میں بھی جو سوریہ سدھانت کی تصنیف کا زمانہ ہے ہندو فضلا اپنے حسابات میں زاویوں کا کسی طرح بھی استعمال نہیں کرتے" [3]

---

[1] زیج محمد شاہی ورق ۲ ب [2] G.R. Kaye. P. 87 [3] G.R. Kaye. P. 87 footnote (3)

ابن جُلجُل

ایک مؤرّخ طبیب

از

از جناب اطہر ریحان فلاحی طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نام اور پیدائش — ابو داؤد سلیمان بن حسان بن جلجل اندلس کے ایک معزز گھرانے میں ۳۳۲ھ میں پیدا ہوئے، عبرانی لغت میں جلجل کے معنی جرس کے آتے ہیں، گویا یہ عربی طرز کا ایک لاطینی نام ہے، غالب گمان یہ ہے کہ ان کے جد امجد جلجل فتح اندلس کے بعد مشرف باسلام ہوئے۔ اس طرز کے اور بہت سے لاطینی نام عربی ترکیب کے ساتھ اندلسی مورخین کے یہاں ملتے ہیں، مثال کے طور پر ابن بشکوال (Pascual) ابن فور تو (Fortuno) اور ابن فیرہ (Ferro) قابل ذکر ہیں۔

تاریخ کی کتابوں میں ابن جلجل کا بڑا مختصر تذکرہ ملتا ہے، انتہا یہ کہ ابن الآبار کے علاوہ شاید ہی کسی مورخ نے اس کی زندگی کے بیشتر پہلوؤں کو اجاگر کیا ہو، ابن الآبار نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب التکملہ میں ابن جلجل پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اور اس کی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کا مناسب جائزہ لیا ہے، ذیل میں التکملہ سے ایک اقتباس کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

حصول علم اور اساتذہ — ابن جلجل ۳۳۲ھ میں پیدا ہوئے، ۳۴۳ھ میں قرطبہ میں حدیث کا درس لیا، اس وقت ان کی عمر دس سال سے زیادہ نہ تھی، جن اساتذہ سے استفادہ کیا، ان میں ابوبکر احمد ابن الفضل الدینوری [1]، ابو الحزم وہب بن مسرۃ [2]، ابو القاسم الاسعد بن عبد الوارث [3] وغیرہ

---

[1] خفاف کے نام سے مشہور ہیں، اندلس کے ایک جید عالم تھے، ۸۲ سال کی عمر میں ۳۴۶ھ

قابلِ ذکر ہیں، اس کے علاوہ محمد بن یحییٰ رباحی عربی ادب کے استاذ تھے، جن سے سیبویہ کی الکتاب سبقاً سبقاً پڑھی اور ۳۵۸ھ میں اس سے فارغ ہوئے، رباحی کے انتقال کے بعد ابوبکر محمد بن عمر القرطبی[1] اور ابو ایوب سلیمان بن محمد الفقیہ[2] سے اکتسابِ فیض کرتے رہے، اس سے فراغت کے بعد علم طب کی طرف رجحان ہوا اور وقت کے اساتذۂ فن سے اسے سیکھا، اور ۲۴ سال کی عمر میں ایک صاحب فن طبیب اور حاذق معالج کی حیثیت سے مطلعِ عالم پر نمودار ہوئے[4]۔

ان مشہور عام اساتذہ کے علاوہ بعض ان اصحاب علم وفن کا تذکرہ جن سے اکتساب فیض کا اعتراف خود ابن جلجل نے کیا ہے، دوسرے سوانح نگاروں کے یہاں نہیں ملتا، مثال کے طور پر احمد بن یونس الحرانی جو کہ ابن جلجل کے معاصر ہیں، ابن جلجل نے اپنی کتاب طبقات الاطباء والحکماء میں کئی مقامات پر ان کے حوالہ سے روایتیں نقل کی ہیں،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۵) میں قرطبہ میں انتقال ہوا (ابن الفرضی ج ۱، ص ۵۹) ۲ فقہ وحدیث کے امام تھے، وادی حجارہ میں پیدا ہوئے اور وہیں ۳۴۶ھ میں انتقال ہوا، اندلس کا سفر بھی کیا تھا، (ابن الفرضی، ج ۱، ص ۲۹) ۳ قرطبہ میں پیدا ہوئے، حدیث کے اچھے عالم اور استاذ تھے، (حوالہ بالا ص ۷۰)

۱ قرطبہ میں پیدا ہوئے اور مشرق کا سفر کیا، فقہ کے معتبر امام اور ادب کے اچھے استاد تھے، ۳۵۰ھ میں انتقال ہوا، (ابن الفرضی، ج ۲، ص ۲۶۴) ۲ اندلس کے ایک مشہور نحوی تھے لغت میں گہری دسترس تھی، تاریخ اندلس کے مصنف بھی ہیں، ۳۶۰ھ میں انتقال ہوا، (ابن الفرضی، ج ۱، ص ۲۷۰) ۳ شذونیہ میں پیدا ہوئے، ۳۳۷ھ میں اندلس آئے، نحو اور فقہ کے مستند عالم تھے ۷۱ سال کی عمر میں ۳۰۱ھ میں انتقال ہوا، (ابن الفرضی، ج ۱، ص ۱۵۹ ۴ التکملہ لابن الآبار، ج ۱ ص ۲۹۷،

دوسرے ابو زکریا یحییٰ بن مالک ہیں، جو کہ العابدی کے نام سے مشہور ہیں، مشرق میں ایک عرصہ قیام کے بعد جب وہ اندلس واپس آئے، تو ہر طبقہ کے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا، چنانچہ سعید بن عبد ربہ کے تذکرہ میں ابن جلجل نے عابدی سے اکتسابِ علم کا اعتراف کیا ہے، "سعید بن عبد ربہ نے اپنے بھتیجے کے لئے جو قصیدہ لکھا تھا، وہ عابدی نے مجھے سنایا"[1]

تیسرے محمد بن عبدون الجبلی ہیں جو کئی برسوں تک مشرق میں قیام کے بعد علم و معرفت کا بیش بہا خزانہ لیکر اندلس واپس آئے تھے، انھوں نے ابن جلجل کو اس سے پوری طرح بہرہ مند کیا، ابن جلجل نے ان کا تذکرہ اپنے شیخ کی حیثیت سے کیا ہے[2]

چوتھے ابو حفص عمر بن بریق جو کہ ابن جزار قیروانی کے مشہور شاگرد ہیں، قیروان سے واپسی پر بعض بڑی اہم علمی دستاویزات ابن جلجل نے ان سے حاصل کی تھیں[3]

ان لوگوں کے علاوہ کسی استاذ کا ذکر نہ تو خود ابن جلجل نے کیا ہے اور نہ ہی دوسرے مورخین نے، ابن جلجل کے چند تلامذہ کا ذکر ملتا ہے، جن میں طلیطلی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، جو ابن البغونش کے نام سے مشہور ہیں، ابن جلجل کے یہ شاگرد رشید طلیطلہ کے رہنے والے تھے ابن جلجل سے علم طب کا حصول کیا، اور ۴۴۴ھ میں انتقال ہوا[4]

علم و اخلاق

صاعد اور قفطی کی کتابوں میں ابن جلجل کے اخلاق و کردار اور علم و فضل کے متعلق مختصر اور غیر مربوط بیانات کے سوا کچھ نہیں ہے، یہی حال دوسرے مورخین کا بھی ہے لیکن بیشتر سوانح نگار اس کے علم و فضل، حسن اخلاق، وضعداری اور سنجیدگی کے معترف ہیں، ابن ابی اصیبعہ نے بھی اگرچہ بہت مختصر لکھا ہے، لیکن پھر بھی عام روش سے ہٹ کر بعض بڑے اہم نصوص قلمبند کئے ہیں، اور یہ تمام نصوص دیسقوریدوس کی کتاب الحشائش میں لکھے گئے ہیں، ابن جلجل کی

---

۱ طبقات الاطباء ص ۱۰۵ ۲ ایضاً ص ۱۱۵ - ۳ ایضاً ص ۶۱

۴ طبقات ابن ابی اصیبعہ، ج ۲ ص ۴۹

تفسیر کے مقدمہ سے ماخوذ ہیں، جن سے ابن جلجل کی مہارت فن حسن اخلاق اور معیاری زندگی کا پتہ چلتا ہے، خاص طور سے اس کی لاطینی زبان سے علمی سرمایہ کو عربی میں منتقل کرنے کی اہم خدمات کا اندازہ ہوتا ہے، ابن جلجل نے نہ صرف یہ کہ فن طب اور طبیبوں کے متعلق اہم کتابیں لکھیں بلکہ اسے معالجات پر بھی عبور تھا، مفردات اور صیدلہ کا بھی ماہر تھا، ابن ابی اصیبعہ نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے،

كان طبيباً فاضلاً خبيراً بالمعالجات	ابن جلجل ایک فاضل طبیب اور بہترین
جيّد التصرف فی صناعة الطبّ	معالج تھا، اسے صیدلہ میں بھی اچھی
كان فی ايام هشام بن الحكم	مہارت تھی، وہ ہشام بن الحکم کے
خدمه بالطب، وله بصيرة	عہد میں اس کا طبی مشیر بھی رہا تھا،
واعتناءٌ بقوى الادوية المفردة	مفردات کے خواص واثرات سے
يعتبر ابن جلجل اول مورّخ	بھی اسے پوری واقفیت تھی، ابن
اسلامی استفاد من الترجمة	جلجل پہلا اسلامی مورخ طب مانا
العربية ونقل منها فی كتابه	جاتا ہے جس نے عبرانی ترجموں سے
بعض النصوص[1]	براہ راست استفادہ کیا، اور بعض
	گراں قدر نصوص بھی نقل کئے،

جیسا کہ ابن ابی اصیبعہ نے معالجات اور فن دواسازی میں اس کی مہارت کے اعتراف کے ساتھ بڑے واضح الفاظ میں بیان کیا کہ مفردات کے افعال وخواص کے متعلق بھی اس کو بہت ٹھوس اور حقیقی واقفیت تھی اس کا ثبوت مفردات پر

[1] طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ ج ۱ ص ۴۶،

لکھی گئی اس کی کتابیں ہیں، جن کا ذکر اپنے محل پر آئے گا، مورخ جرجی زیدان نے بھی اس کا گیاہ شناس کہہ کر ذکر کیا ہے۔[1]

اس سے قطع نظر کہ ابن جلجل موید باللہ کا طبیب خاص تھا، اور دربار خلافت میں اس کی بڑی رسائی تھی، وہ ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، درباری ہونے کے باوجود بھی اس نے اپنے خاندانی وقار کو مجروح نہ ہونے دیا تھا، وہ بے جا خوشامد پسند نہیں تھا، تاریخ و سیر کی کتابوں میں کوئی ایسا واقعہ میری نظر سے نہیں گذرا جس سے اس کا حسن کردار مجروح ہوتا ہو وہ ایک باعزت اور شریف انسان تھا، ذائت وپستی یا پیشہ ورانہ رنگ اس کی زندگی کے کسی پہلو میں نہیں دیکھا جا سکتا، طبابت کے معزز پیشے کو اس نے محض کھانے کمانے کا ذریعہ نہیں بنایا تھا، بلکہ خدمت خلق کو اپنا فرض سمجھتا رہا تھا، یہی وجہ ہے کہ بیشتر مورخین اس کی عظمت کے معترف ہیں،

تاریخ وفات | اکثر سوانح نگار اس سلسلے میں بالکل خاموش ہیں، البتہ حاجی خلیفہ نے لکھا ہے کہ ابن جلجل کی وفات ۳۷۲ھ کے بعد کسی قریبی سال میں ہوئی، اسی سال اس نے اپنی کتاب تفسیر اسماء الادویۃ المفردہ تصنیف کی، حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے، کیونکہ ۳۷۷ھ میں اس نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "طبقات الاطباء والحکماء" مکمل کی تھی، ابن الآبار کی روایت ہے:

"والّف كتاباً حسناً فی طبقات الاطباء والحكماء وفرغ منه فی سنة سبع وسبعين وثلاثمائة"[2]

[1] تاریخ التمدن الاسلامی از جرجی زیدان ترجمہ فارسی ص ۵۹۰،

[2] التکملہ ج ۱ ص ۲۹۷،

اول الذکر روایت کی تصدیق عمر رضا کحالہ کے قول "کان حیا الی سنہ ۳۷۲ھ" سے بھی ہوتی ہے[1] ...... یہی بات بغدادی نے بھی لکھی ہے، "المتوفی فی حدود سنہ ۳۷۳ھ"[2]

لیکن تعجب ہے کہ مورخین نے طبقات الاطباء والحکماء کے سال تالیف کو کیسے نظر انداز کر دیا، اس ضمن میں یہ چیز بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے، کہ ابن جلجل کے شاگرد رشید سعید بن محمد الطلیطلی جو کہ ابن البغونش کے نام سے مشہور ہیں، انھوں نے ابن جلجل سے اکتساب فیض کے لئے قرطبہ کا سفر کیا تھا، ان کی پیدائش ۳۶۹ھ میں ہوئی تھی اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہے، اب اگر یہ مان لیا جائے کہ ابتدائی تعلیم کے بعد زیادہ سے زیادہ پندرہ سال کی عمر میں حصول علم طب کے لئے سفر کیا ہو تو بھی ۳۸۴ھ سے قبل ابن جلجل سے کسب علم ناممکن ہے، ابن البغونش کے اس سفر کا ذکر دیگر مورخین کے علاوہ قاضی صاعد اندلسی، اور ابو محمد ابن حزم نے بھی کیا ہے،[3]

ان تفصیلات کی روشنی میں وفات کی کسی متعین تاریخ کا ذکر نہ کر کے بس اتنا ہی وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ابن جلجل نے ۳۸۴ھ کے بعد کسی سال میں وفات پائی، کیونکہ اس کے بعد نہ تو اس کی کسی تصنیف کا پتہ چلتا ہے، اور نہ ہی کسی اور ذریعہ سے اس کے زندہ رہنے کا پتہ چلتا ہے

خود نوشت سوانح حیات ابن جلجل نے اپنی مشہور عام کتاب طبقات الاطباء والحکماء کے آخر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے،

"وصفت ایها الشریف فی آخر هذه الرسالة تادبی و سیرتی وکیف کان طلبی وتوخیت الصدق والله الشاهد علی ما اقول ولم ار اخلاء هذه الرسالة من ذالک لما فیه من تخلید الذکر وجمیل النشر، وبالله استعین"[1]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن جلجل نے ایک ضمیمہ اپنی کتاب طبقات الاطباء والحکماء کے آخر میں بطور تتمہ شامل کر دیا تھا، جس میں اس نے اپنی زندگی، تعلیمی سرگرمیاں، اخلاق و عادات، اور خاندانی امور پر روشنی ڈالی تھی، لیکن افسوس ہے کہ وہ حصہ ہم تک نہ پہونچ سکا، اور بے احتیاطی کی نذر ہو گیا، کیونکہ موجودہ شائع شدہ کتاب میں یہ حصہ موجود نہیں ہے،

صاعد ابن ابی اصیبعہ اور قفطی وغیرہ نے طبقات الاطباء سے خوب خوشہ چینی کی ہے، اور اس کے حوالہ سے بیشتر اندلسی اطباء کے حالات قلمبند کئے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس ضمیمہ کا ذکر نہیں کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ انہیں وہ خود نوشت سوانح مل ہی نہ سکی، ورنہ ابن جلجل کے حالات کو تشنہ اور غیر مرتب چھوڑ کر آگے نہ بڑھ جاتے،

اس کے باوجود بھی اُن کی خود نوشت سوانح عمری سے یکسر انکار نہیں کیا جا سکتا، ابن الابار نے "التکملہ"[2] میں نہ صرف اس کا ذکر کیا ہے، بلکہ بعض اقتباسات بھی اس کے

---

[1] معجم المؤلفین ص ۲۵۸، [2] ایضاح المکنون ج ۲ ص ۷۸،
[3] طبقات الامم ص ۸۰-۸۱

---

[1] طبقات الاطباء ص ۱۱۶
[2] التکملہ ج ۱ ص ۲۹۰،

حوالہ سے درج کئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ابن الآبار طبیب موصوف کے سب سے تفصیلی سوانح نگار ہونے کے باوجود تاریخ وفات کی تعیین نہیں کر سکے ہیں، اگر اُن کے پیش نظر خود نوشت سوانح کے علاوہ کوئی اور ماخذ ہوتا تو وہ تاریخ وفات بھی لکھتے لیکن کسی خود نوشت سوانح میں تاریخ وفات کا ذکر نا ممکن ہے،

اس سوانح حیات کی تصدیق ایک اور چیز سے بھی ہوتی ہے، وہ یہ کہ ابن الآبار نے ابن جلجل کے بڑے بھائی کے تذکرہ کے ضمن میں بعض معلومات کی تصدیق یہ کہہ کر کر دی ہے کہ اسے محمد بن حسان کے چھوٹے بھائی ابن جلجل نے اپنی کتاب طبقات الاطباء میں بیان کیا ہے، حالانکہ محمد بن حسان طبیب نہیں تھے، پھر طبقات الاطباء میں اُن کا ذکر کیونکر آیا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ خود نوشت سوانح کا باب جو اس کتاب کے آخر میں شامل تھا، اس میں اُن کا تذکرہ تھا، نہ کہ اصل کتاب میں، ابن الآبار نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ اپنے بھائی کا تذکرہ ابن جلجل نے اپنے اساتذہ کے ضمن میں کیا ہے،

تصنیفی کارنامے (۱) **طبقات الاطباء والحکماء** :- ابن جلجل کی یہ معرکۃ الآراء تصنیف ۳۷۷ھ میں منظر عام پر آئی، اُس کی تالیف میں اُس نے ابو معشر بلخی کی کتاب "الالوف" سے کافی استفادہ کیا ہے، اور اہم مراجع کی حیثیت سے جگہ جگہ اس کا حوالہ بھی دیا ہے، اس کے علاوہ اسپینی مورخ بادلوس اور روسیوس کی کتاب ہروشیوش پادری اور یوونیم کی کتاب القرو انقہ جس میں قدیم تاریخی واقعات درج ہیں، بشیر الاشبیلی المطران کی الاصول والاشتقاق بھی اس کے مراجع میں داخل ہیں،[1]

---

[1] مقدمہ طبقات الاطباء والحکماء از فواد رشید،

کتاب میں مندرج حوالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ارسطو کی کتاب السیاسۃ، بقراط کی عہد بقراط، افلاطون کی النوامیس، جالینوس کی الامراض العسرۃ، قاطاجانس کی الادویۃ الطبیہ اور ینبغی للطبیب ان یکون فیلسوفاً وغیرہ ایک عرصہ تک اس کے مطالعہ میں رہی ہیں، اور اپنی کتاب کی تالیف میں اس نے ان اہم مراجع سے بڑی مدد لی ہے، الکندی وغیرہ سے بھی استفادہ ثابت ہے۔[1]

اس کے علاوہ یحییٰ بن اسحاق کے حوالہ سے بھی اس میں بہت سی حکایات مذکور ہیں۔

یہ کتاب بعد کے مورخین کے مراجع میں داخل ہے اور اسے بڑی اہمیت حاصل رہی ہے، ابن الآبار، قفطی ابن ابی اصیبعہ، صاعد اور حاجی خلیفہ وغیرہ نے بہت سے واقعات اس کتاب کے حوالہ سے ذکر کئے ہیں، قفطی نے تو اپنی کتاب میں ۱۰ سے زائد جگہوں پر مختلف تذکروں کے ضمن میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

ان مذکورہ مورخین کے علاوہ بغدادی نے ایضاح المکنون میں[2]، ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں[3]، حمیدی نے جذوۃ المقتبس میں[4]، احمد عیسیٰ نے معجم الاطباء میں[5]، احمد بن یحییٰ نے بغیۃ الملتمس میں[6] اس کتاب کا تذکرہ کیا ہے۔

---

[1] طبقات الاطباء: ص ۳۹ بضمن ذکر اقلیدس
[2] ص ۵٦۱ [3] ج ۲، ص ۸۷ [4] ص ۲۱۹ [5] ص ۲۰۷۔
[6] ص ۲۸۵۔

ابن جلجل پہلا اندلسی طبیب اور مورخ طبیب ہے جس نے تاریخ طب پر پہلی اتنی جامع اور مربوط کتاب لکھی، اس موضوع پر اس سے قبل بھی کئی مصنفین نے قلم اٹھایا لیکن ان کے کام کی نوعیت بے حد محدود ہے، ان میں حنین بن اسحاق متوفی ۲۶۰ھ، یعقوبی ۲۸۴ھ، اسحاق بن حنین متوفی ۲۹۸ھ صاحب نوادر الاطباء، المسعودی متوفی ۳۴۶ھ، زکریا رازی متوفی ۳۱۱ھ، ابن الندیم متوفی ۳۸۰ھ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

حنین بن اسحاق کی کتاب تاریخ الحکماء والاطباء کا شمار تاریخ الاطباء میں ہوتا ہی نہیں اس لئے کہ اس میں محض کچھ حکیموں اور فلسفیوں کے فرمودات، مقولے، اور ان سے متعلق چند حکایات جمع کر دی گئی ہیں، یعقوبی کی تاریخ خالص اطباء کی تاریخ وسوانح پر مشتمل نہیں ہے، البتہ بہت سے مشہور طبیبوں کے تذکرے اس میں ضرور مل جاتے ہیں، امام رازی کی تاریخ "سیرۃ الحکماء" کا ذکر صرف ابن ابی اصیبعہ نے کیا ہے، جبکہ یہ کتاب کہیں موجود نہیں ہے، اگر اس کا کہیں وجود ہوتا تو دوسرے مورخین بھی ضرور ذکر کرتے، ہو سکتا ہے کوئی مقالہ اس موضوع پر امام موصوف نے لکھا ہو اور مخطوطہ یا اس کی نقل ابن ابی اصیبعہ کو مل گئی ہو اور اس کو انھوں نے کتابچہ تصور کرتے ہوئے ان کی کتابوں میں شمار کر دیا ہو، جسے بہر حال تاریخ طب کے موضوع پر کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں کہا جا سکتا، المسعودی کی کتاب التنبیہ والاشراف بھی خاص طور سے اطباء کے حالات زندگی اور ان کے علمی کارناموں پر مخصوص نہیں ہے، ابن الندیم کی "الفہرست" کا بھی یہی حال ہے، یہ بھی طبیبوں کی زندگیوں پر ہی مشتمل نہیں ہے اتنا ضرور ہے کہ اس میں بہت سے اطباء کے تذکرے موجود ہیں، ان وجوہ کی بناء پر مذکورہ کتابوں اور ان کے مصنفین کو ابن جلجل پر ترجیح نہیں دی جا سکتی، اس میں شک نہیں کہ اسحاق بن حنین اسلام کے سب سے پہلے مورخ طب شمار ہوتے ہیں، اور انھوں نے تاریخ الاطباء والحکماء نام کی ایک کتاب بھی لکھی ہے، لیکن چونکہ اس کا تعلق ماقبل اسلام کے اطباء اور ان کے حالات سے ہے اس لئے اس کا موازنہ بھی

ابن جلجل کی اس تالیف سے کرنا غلط ہے، گویا ابن جلجل سے پہلے طبقات کے طرز پر کوئی بھی تاریخ اطباء نہیں لکھی گئی تھی، اس کمی کا احساس خلیفۂ وقت کو بھی تھا اور اس کے مطالبہ پر ہی ابن جلجل نے یہ کتاب تالیف کی، اس کا ذکر ابن جلجل نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

ذکرت انک لم تر لاحد من المتقدمین فی ذلک کتابا مرتبا ولا کلاما مقنعا مشبعا فصادفت منی نشاطا الی تقیید ما سألت[1]۔

۱۹۵۵ء میں ڈاکٹر فواد رشید[2] نے اس مخطوطہ کو ایڈٹ کر کے ایک پُر مغز مقدمہ کے ساتھ پہلی بار شائع کیا، اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ادوار کے لحاظ سے طبقات کی شکل میں بڑے اختصار و ایجاز سے اطباء کے حالات قلمبند کئے ہیں، ضروری باتوں کے علاوہ قافیہ آرائی یا نثر نگاری سے قطعاً احتراز کیا ہے اور ہر طبیب کی خاص مہارت یا امتیازی نشان ہی کا ذکر کیا ہے، ان کی کتابوں اور ذاتی حالات بھی لکھے ہیں، بعض فلسفیوں کے تذکرے بھی آ گئے ہیں، لیکن بہر حال تاریخ کی دوسری کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی طبیب تھے، البتہ ایسا ضرور ہے کہ وہ طبیب کم فلسفی زیادہ رہے ہوں، اس کتاب سے ہر طبیب کے بارہ میں مختصر حالات اور ان کے علمی و تصنیفی کارناموں کا ایک نظر میں اندازہ ہو جاتا ہے۔

مورخین کے درمیان اس کتاب کے نام کے سلسلے میں اختلاف رائے ہے، بیشتر مورخین نے اسے مختلف ناموں سے ذکر کیا ہے، یہاں تک کہ جس نسخہ کو ڈاکٹر فواد رشید نے ایڈٹ کیا ہے، اس کے بارے میں خود ان کا کہنا ہے کہ اس پر کوئی نام نہیں درج تھا، بلکہ سرورق کے بغیر ہی کتاب شروع ہو گئی تھی، اس میں اس بات کا بھی امکان ہے کہ سرورق غائب ہو گیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ مؤلف نے قصداً

---

[1] طبقات الاطباء والحکماء ص ۱۔ [2] ڈاکٹر فواد رشید ازہر یونیورسٹی کی لائبریری میں شعبۂ مخطوطات کے انچارج ہیں، انھوں نے کئی کتابیں ایڈٹ کی ہیں

ایسا کیا ہو، اول الذکر خیال زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ اکثر مورخین نے اس کا نام نفس مضمون سے استنباط کر کے لکھا ہے:

حتی ان النسخة التی اعتمدنا علیها فی نشر الکتاب لا تقدم لنا اسما صریحا فقد خلت من صفحة العنوان وبدأت بمتن الکتاب مباشرة ولست ادری ان کانت ورقة العنوان من النسخة ام انها فعلاً خلواً منه۔[۱]

چنانچہ ابن ابی اصیبعہ نے اس کتاب کے متعلق بس اتنا لکھا ہے:

کتاب یتضمن ذکر شیئ من اخبار الاطباء والفلاسفة[۲]

قفطی نے بھی کوئی متعین نام لئے بغیر صرف یہ لکھا ہے:

له تصنیف صغیر فی تاریخ الحکماء ولم یشف منه علیلاً۔[۳]

ابن جلجل کی حکماء کی تاریخ پر ایک بہت مختصر کتاب ہے جس سے تشفی نہیں ہو سکتی، صاحب کشف الظنون کا بیان ہے کہ ابن ابی اصیبعہ اور ابن جلجل دونوں نے طبقات الاطباء لکھی ہے، ابن حزم نے اپنے ایک مضمون "فضائل علماء اندلس" میں ابن جلجل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "ابن جلجل کی ایک تصنیف اخبار الاطباء ہے"[۴] احمد بن یحییٰ نے بھی ابن جلجل کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ اس کی ایک کتاب "اخبار الاطباء بالاندلس" ہے:

سلیمان بن حسان بن جلجل مذکور بالطب والادب له کتاب فی اخبار الاطباء بالاندلس۔[۵]

لیکن ایسا لگتا ہے کہ یا تو احمد بن یحییٰ نے ابن جلجل کی یہ کتاب دیکھی نہیں اور یہ فرض کر لیا کہ چونکہ وہ اندلسی

---

[۱] مقدمہ طبقات الاطباء از فواد رشید [۲] طبقات ابن ابی اصیبعہ ص ۴۸ [۳] تاریخ الحکماء ص ۱۹۰۔
[۴] نفح الطیب ج ۲، ص ۱۱۹ [۵] بغیۃ الملتمس ص ۲۸۵۔

مورخ طبیب ہے، اس لئے تاریخ طب پر لکھی گئی اس کی کتاب اندلسی اطباء کے حالات زندگی پر ہی ہوگی، حالانکہ امر واقعہ اس کے برعکس ہے، اس لئے کہ اس میں ابن جلجل کے عہد سے پہلے کے تمام ہی اطباء کا طبقات کے اعتبار سے ذکر ہے، یا یہ کہ اس نام کی کوئی اور کتاب بھی ہو جس کا ذکر بہر حال ان کے علاوہ کسی نے نہیں کیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ابن جلجل نے اپنی کتاب کا کوئی متعین نام دیا ہی نہیں تھا؟ ڈاکٹر فواد رشید کے مطابق اب یہ بات مختلف قرائن سے صاف ہو گئی ہے کہ "طبقات الاطباء والحکماء" خود اس کا اپنا دیا ہوا نام ہے، انھوں نے جو چند دلائل دئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) کتاب کے موضوع اور اس کی ترتیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں اطباء کے حالات زندگی اور ان کے کارناموں کا تذکرہ ہے، اور ان کو نو طبقات میں زمانہ کے لحاظ سے تقسیم کر دیا گیا ہے جو اسم با مسمّٰی کی دلیل ہے۔

(۲) ابن الآبار نے ابن جلجل کی خود نوشت سوانح حیات کا جو اقتباس نقل کیا ہے، اس میں "طبقات الاطباء" کا تذکرہ ہے، ابن الآبار نے لکھا ہے کہ یہ نام ابن جلجل نے ہی رکھا ہے۔

(۳) ابن الآبار نے محمد بن حسان کے حالات زندگی قلمبند کرتے ہوئے بعض واقعات نقل کئے ہیں اور لکھا ہے کہ ابن جلجل نے اپنی کتاب "طبقات الاطباء" میں اسے بیان کیا ہے۔

(۴) اصبغ بن یحییٰ طبیب کے تذکرہ میں ابن الآبار نے بعض اہم نصوص اس کی زندگی سے متعلق لکھے ہیں، اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ابن جلجل نے اپنی "طبقات الاطباء" میں بیان کیا ہے۔

(۵) تیسری چوتھی صدی ہجری میں طبقات کے طرز پر تاریخ و سیر کی کتابیں لکھنے کا عام رواج تھا یا پھر حروف تہجی کے اعتبار سے کتابیں تصنیف کی جاتی تھیں، ابن جلجل کے ایک معاصر ابوبکر الزبیدی متوفی ۳۷۹ھ نے نحویوں کی تاریخ مرتب کی تھی اور اپنی کتاب کا نام "طبقات النحویین واللغویین"

رکھا تھا[1]

اس طرح اب یہ بات نہایت قرین قیاس ہے کہ ابن جلجل نے اپنی کتاب کا نام خود ہی "طبقات الاطباء والحکماء" رکھا تھا، لیکن بعد میں مسودہ سے سرورق غائب ہو جانے کی وجہ سے مورخین کو کتاب کا اصل نام نہ معلوم ہو سکا، لیکن ابن الآبار جنھوں نے ابن جلجل کی خود نوشت سوانح عمری دیکھی تھی، ان کی اس بات میں بڑا وزن ہے کہ "اس نے اپنی کتاب کا نام طبقات الاطباء رکھا تھا"[2] جس کی تائید صاحب کشف الظنون نے بھی کی ہے، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے ابن جلجل اور ابن ابی اصیبعہ دونوں ہی نے طبقات کے طرز پر اطباء کی سوانح عمری مرتب کی ہے، یہ دونوں بھی اسی نام سے شائع ہو چکی ہیں۔

(۲) تفسیر اسماء الادویۃ المفردۃ من کتاب دیسقوریدوس

ابن جلجل نے یہ کتاب ۳۷۲ھ میں موید باللہ کے عہد میں تصنیف کی[3]، ۳۳۷ھ میں شہنشاہ قسطنطنیہ ارمانیوس نے خلیفہ عبدالرحمن کو بہت سی کتابیں ہدیہ میں بھیجی تھیں، ان میں دیسقوریدوس کی کتاب الحشائش کا بھی ایک نسخہ تھا، لیکن اغریقی زبان میں ہونے کی وجہ سے اس سے استفادہ ممکن نہیں تھا، چنانچہ خلیفہ موصوف کے مطالبہ پر ارمانیوس نے نیقولا راہب کو بطور مترجم قرطبہ بھیجا، اس سے قبل خلیفہ جعفر المتوکل کے عہد میں کتاب الحشائش کو اصطفن بن بسیل نے اغریقی سے عربی میں منتقل کیا تھا، جسے بعد میں یوحنا بن ماسویہ کے شاگرد رشید حنین بن اسحاق نے ترمیم و اضافہ کے ساتھ مرتب کیا تھا، لیکن اب بھی اس میں بڑا سقم تھا، بعض اغریقی ناموں کو عربی میں منتقل کرنے میں دونوں ہی ناکام رہے تھے۔

چنانچہ راہب نے اصطفن کے ترجمے کے تشریح طلب مواقع اور نامعروف الفاظ کی تحقیق و ترجمہ کا کام شروع کیا، ابھی ترجمہ مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ راہب کا انتقال ہو گیا، ابن جلجل دربار خلافت میں اپنی

[1] مقدمہ طبقات الاطباء والحکماء فواد سید [2] التکملۃ لابن الآبار بضمن تذکرۂ ابن جلجل [3] طبقات ابن ابی اصیبعہ ص ۴۸۰۔

پہونچ کی وجہ سے راہب کے بہت قریب تھے اور بڑی حد تک اغریقی زبان اس سے سیکھ لی تھی، چنانچہ اس کے انتقال کے بعد اسی کام کو دوسرے مترجمین کے ساتھ انجام دیا[1]

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نسطوری اور یعقوبی عیسائیوں نے سریانی زبان میں یونانی علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمے کئے تھے، اسلامی فتوحات کے بعد انھوں نے ہی سریانی سے عربی میں ان کتابوں کو منتقل کیا، لیکن ان ترجموں میں دو عیب بہت زیادہ نمایاں تھے: ایک تو یہ کہ وہ بالکل ترجمے ہی ترجمے تھے، نہ ان میں ایجاد و اختراع سے کام لیا تھا اور نہ ہی جدید نظریات و خیالات پیش کئے گئے تھے، دوسرے یہ کہ ترجمے صحت اور دقت نظری کے ساتھ نہیں کئے گئے تھے بلکہ مترجمین نے کم علمی کی بنا پر ان میں بہت کچھ رد و بدل کر دیا تھا[2]، چنانچہ کتاب الحشائش کے ساتھ بھی لازمی طور پر یہی کچھ ہوا تھا جس کی وجہ سے کئی بار اس کتاب کے ترجمے کرنے پڑے۔

دیسقوریدوس کی کتاب الحشائش میں نہ صرف یہ کہ ابن جلجل کا نام آتا ہے بلکہ اس کی تفسیر و تشریح مذکورہ کتابی شکل میں پیش کی، افسوس کہ اس کتاب کا تذکرہ تو بیشتر مورخین نے کیا ہے، لیکن یہ کہیں دستیاب نہیں ہے، غافقی اور ابن بیطار نے مفردات پر لکھی گئی اپنی کتابوں میں ابن جلجل کی اس کتاب کے حوالے دئے ہیں، ابن ابی اصیبعہ نے ابن جلجل کے اس کتاب پر لکھے گئے مقدمہ کے حوالہ سے بہت اہم نصوص درج کئے ہیں، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔

مورخ جرجی زیدان نے بھی اس کتاب اور ابن جلجل کی مفردات کے سلسلہ میں ٹھوس معلومات کو بہت سراہا ہے، اس کا اعتراف بھی اس نے کیا ہے کہ بعض جڑی بوٹیاں جو کہ دیسقوریدوس کی کتاب میں مذکور تھیں، ان کی تشریح بھی اس نے کی ہے:

"در ذیل کتاب دیسقوریدس گیاہ ہائے را شرح دادہ کہ قدماء آنہا نمی دانستہ اند"[3]

[1] مقدمہ طبقات الاطباء [2] حکماء اسلام ج ۱ ص ۸۰ از مولانا عبدالسلام ندوی [3] تاریخ التمدن الاسلامی ترجمہ فارسی ص ۵۰۶ از جرجی زیدان۔

(۳) مفردات پر ایک اہم کتابچہ | ابن ابی اصیبعہ اور صفدی نے اس مقالہ کا تذکرہ کیا ہے، ان کے مطابق یہ کتابچہ ان مفرد ادویہ کے بیان پر مشتمل ہے جس کا ذکر دیسقوریدوس نے اپنی کتاب الحشائش میں نہیں کیا تھا[1]

(ابن ابی اصیبعہ نے اس سلسلہ میں ابن جلجل کے اسی مقالہ کا ایک اہم اقتباس بھی نقل کیا ہے:

ان دیسقوریدوس اغفل ذلك اما لانه لم یره ولم یشاهده عیاناً وامّا لان ذلك كان غیر مستعمل فی دهره وابناء جنسه[1].

(دیسقوریدوس نے ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے، اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ خود اس کے مشاہدہ میں یہ ادویہ نہ رہی ہوں، دوسرے یہ کہ اس کے دور میں ان دواؤں کی طبی خصوصیات عام طور پر لوگوں کو معلوم نہ رہی ہوں.)

ڈاکٹر فؤاد رشید نے لکھا ہے کہ آکسفورڈ لائبریری میں "استدراک علی کتاب دیسقوریدوس" کے عنوان سے ابن جلجل کی ایک چھوٹی طبی کتاب ہے[2]۔ غالب گمان یہ ہے کہ یہی وہ مقالہ ہو جس کا ذکر بغیر کسی متعین نام کے ابن ابی اصیبعہ اور صفدی وغیرہ نے کیا ہو۔

(۴) مقالۃ فی ادویۃ التریاق | اس کا تذکرہ بھی صفدی وغیرہ کے یہاں ملتا ہے. فواد رشید کی تحقیق کے مطابق یہ کتابچہ بھی آکسفورڈ لائبریری میں موجود ہے، اس کتاب میں ان کے مطابق بعض مفید اور اہم تریاقات کا ذکر ہے، جس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا[3]، لیکن افسوس کہ ابھی تک یہ کتاب باقاعدہ طور پر منظر عام پر نہ آسکی جو بہر حال ابن جلجل کے بلند معیار پر لکھی گئی ہوگی اور جس سے طبی دنیا اس تجرباتی اور سائنٹفک دور میں بڑے مفید اور کارآمد مقاصد حاصل کر سکتی تھی.

(۵) رسالۃ التبیین فیما غلط فیہ بعض المتطببین | یہ رسالہ بھی دستیاب نہیں ہے، البتہ اس کا ذکر مورخین کے یہاں ملتا ہے، ابن ابی اصیبعہ اور صفدی کے بموجب اس رسالہ میں بعض پیشرو اطباء کی

---

[1] عیون الطبقات ابن ابی اصیبعہ ص ۴۸ [2] مقدمہ طبقات الاطباء از فواد رشید [3] مقدمہ طبقات الاطباء از فواد رشید.

غلطیوں اور علمی خامیوں کی طرف نشاندہی کی گئی ہے، یا جو چیزیں پیش رو اطباء سے رہ گئی تھیں، ان کا اضافہ کیا گیا ہے.

جیسا کہ اوپر گذر چکا احمد بن یحییٰ نے ابن جلجل کو ادیب کی حیثیت سے بھی متعارف کرایا ہے:

سلیمان بن حسان بن جلجل مذکور بالطب والادب[1].

تاہم اس کے کسی ادبی شاہکار کا پتہ نہیں چل سکا ہے.

حقیقت یہ ہے کہ مورخوں اور سوانح نگاروں نے اس فنکار طبیب اور پہلے مسلمان مورخ طبیب کو اب تک گوشۂ گمنامی میں پڑا رہنے دیا، اور اس کے ساتھ بڑی حق تلفی اور ناانصافی کی.

---

[1] بغیۃ الملتمس ص ۲۸۵ وابن ابی اصیبعہ ص ۴۸.

شاہ اسد الرحمٰن قدسیؒ

از جناب محمود الرحمٰن صاحب، کراچی

بہت سے انسان موت کے بعد فراموش کر دیئے جاتے ہیں، لیکن بعض اس مرتبے کے ہوتے ہیں کہ ان کی یاد لمحے بھر کو بھی دل سے محو نہیں ہوتی، اور زندگی کے ہر موڑ پر ان کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔

ایسی ہی عالی مرتبت ہستیوں میں حضرت شاہ اسد الرحمٰن قدسی علیہ الرحمۃ بھی تھے، طریقت ہو کہ شریعت، قلندری ہو کہ درویشی، علم ہو کہ عرفان، ادب ہو کہ آگہی، فلسفہ ہو کہ حکمت، تفکر ہو کہ تصوف، ہر صنف میں انھیں مقام اولیت حاصل تھا۔

برصغیر پاک و ہند کے تمام اکابر آپ کی فکر و نظر، علم و دانش، تبحر علمی قلندرانہ شان، حسن اخلاق، شفقت و محبت اور روحانی مقام و مرتبے کے معترف رہے ہیں، ہر مکتبۂ خیال کے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر سکون و اطمینان کی دولت سے مستفید ہوتے رہتے ہیں، ہر فکر و تشویش ان کی صحبت میں کالعدم ہو جایا کرتی تھی، اور ہر عقدۂ لاینحل اس پیر کامل کی مجلس میں حل ہو جایا کرتا تھا، اور سائل آستانۂ قدسیؒ شاد کام و بامراد لوٹتا تھا۔

آپ کا اسم گرامی ناصر الدین محمد اسد الرحمٰن قدسی تھا۔ آپ کے جد امجد شیخ الاسلام شاہ ابو المکارم، جن کا سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادقؓ سے ملتا ہے، سبزوار کے رہنے والے تھے، وہاں سے ہجرت کر کے ہندوستان تشریف لائے اور قطب الاقطاب حضرت

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے خاندان میں متاہل ہوئے، آگے چل کر اس خاندان میں ایک بہت مشہور بزرگ حضرت شاہ نجف علی گذرے ہیں، جو حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ کے شاگرد و خلیفہ تھے، موصوف کی اہلیہ محترمہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی حقیقی بہن تھیں۔ جن سے حضرت شاہ حبیب الرحمٰن پیدا ہوئے۔

آپ کی والدۂ محترمہ علامہ محمد اسحٰق کی دختر تھیں۔ ان کی زبان فارسی تھی، اردو اور پشتو بھی بولتی تھیں۔ اپنے والد سے عربی پڑھی تھی، اور حافظ کلام اللہ تھیں۔

آپ کی ولادت ۱۲/ رجب ۱۳۰۹ھ بروز دوشنبہ بوقت صبح صادق ہوئی۔ جب آپ چار سال کے ہوئے تو والدۂ محترمہ نے قرآن مجید پڑھانا شروع کیا، آپ نے جس دن قرآن مجید ختم کیا، والدہ صاحبہ نے خواب میں دیکھا کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رحل پر قرآن کھولے ہوئے اول سے آخر تک پورا قرآن شریف سنایا اور سرکارؐ نے ایک بڑا تھیلا جس میں اخروٹ کے برابر کوئی سے بھری ہوئی تھی، عنایت فرمایا۔

چھٹے برس کتابی تعلیم اور اس کے ساتھ روحانی تربیت والد بزرگوار کی زیر نگرانی مسلسل سات برس تک ہوتی رہی۔ قرآن پاک، تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم سے فراغت کے بعد والد نے آپ کو لاہور بھیج دیا۔ جہاں آپ نے پانچ سال تک مقیم ہو کر مختلف علوم و فنون میں دستگاہ حاصل کی۔

اٹھارہ برس کی عمر میں درس و تعلیم سے فراغت حاصل کر کے بھوپال واپس آگئے، اور روحانی مشاغل کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس دوران والد بزرگوار حضرت شاہ حبیب الرحمٰن نے جو حضرت کے مرشد طریقت بھی تھے، رحلت فرمائی۔ رخصت سے دو ہفتے پہلے بعد نماز مغرب حضرت قدسیؒ کو تسبیح، مصلےٰ، کلاہ اور اوراد و وظائف کا قلمی مجموعہ حوالہ کر کے ارشاد فرمایا کہ

"مجھے ہدایت ہوئی ہے کہ تم کو اپنا جانشین مقرر کردں۔ میری وفات کے بعد بارہ ۱۲ برس تک مجاہدات میں مشغول رہنا۔ کتاب وسنّت کے بغیر کوئی عمل اختیار نہ کرنا۔"

آپ نے اپنے والد ماجد کے حکم پر پوری طرح عمل کیا، اور کامل بارہ ۱۲ سال تک سخت مجاہدے میں مصروف رہے۔ دن بھر روزہ رکھتے۔ شام کو کچھ خرمے اور چائے سے افطار کرتے۔ بقیہ سارا وقت عبادت وریاضت میں گذرتا۔ بھوپال کی جس ویران مسجد میں تنہا تین سال کا عرصہ گذرا۔ وہاں ایک پرانا بوریا جس کے سرہانے دو اینٹیں رکھی ہوئی تھیں ایک کمبل، ایک پانی کا گھڑا اور ایک مٹی کا لوٹا تھا، صاحبِ ولایت کا بس یہی اثاثہ تھا۔ اس تمام عرصے میں شب بیداری آپ کا معمول خاص رہا۔

بارہ سالہ مجاہدہ ختم ہونے پر مولانا اشرف علی تھانویؒ نے آپ کو "ولی الاشرف" کا لقب عنایت فرمایا۔ حضرت شاہ محمد سلیمان پھلواردیؒ نے "حبیب الاولیا" کے خطاب سے نوازا۔

حضرت قدسی نے ۱۳۵۰ھ میں سفرِ حج اختیار کیا۔ اور مدینہ منورہ میں سرکار دوعالمؐ کے روضے پر حاضری دی۔ وہیں آپ حضرت سید حمزہ رفاعیؒ کی زیارت سے مشرف ہوئے تو حضرت اقدس نے جو سالہا سال سے خلوت نشیں تھے۔ اپنا تجدید شدہ طریقہ تفویض فرما کر خلعتِ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا کہ "تمہاری امانت میرے پاس محفوظ تھی، اور عرصۂ دراز سے میں تمہارا منتظر تھا۔ الحمد للہ کہ اس بارِ امانت سے جلد دی ہوا، یہ چیز دربارِ نبویؐ سے روحانی طور پر عطا ہوئی۔ خواجہ حسن نظامی نے اس خبر کو اپنے اخبار "منادی" مورخہ یکم فروری ۱۹۴۰ء میں شائع کیا تھا۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو حضرت قدسیؒ سے خصوصی عقیدت تھی، اپنی پیرانہ سالی کے زمانے میں حضرت مرحوم کو خط لکھا کہ

"میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ کچھ سکت ہوتی تو حاضرِ آستانہ ہو کر خدمت کرتا، کیا ہی اچھا ہو کہ آپ یہاں رونق افروز ہو کر باعث خیر وبرکت ہوں۔

مولانا کی اس درخواست پر ہمارے مرشد گرامی تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ معزز میزبان نے مقتدر مہمان کو ٹھہرانے کے لئے بستی سے باہر خیمہ گاہ کا بندوبست فرمایا۔ اس میزبانی سے کچھ عرصہ قبل مولانا موصوف کو خواب میں اس جگہ ایک بارونق منظر کا مشاہدہ ہوا تھا، عجب اتفاق، حضرت قبلہ کو یہ جگہ پسند آئی۔ اور ایک فرودگاہ تعمیر کرائی، جس کو مولانا تھانوی نے "آستانۂ قدسی" کے نام سے موسوم فرمایا۔ اور مندرجۂ ذیل تاریخی قطعہ لکھا۔ اور اسے ایک سنگ مرمری لوح پر کندہ کرا کر آستانے کی دیوار میں نصب کرا دیا۔

قطعہ

گرد قدسی نزول چوں ایں جا   جستم از دل سن ظہور سرور
گفت دل آستانۂ قدسی (۶۶۱)   ہم بیفزا بر و تجلی طور (۶۵۸)

کتبہ فقیر اشرف علی تھانوی

مولانا ممدوح نے اس دوران یہ وصیت کی تھی کہ جس جگہ حضرت قدسی کا پلنگ بچھا ہے، مجھے وہیں پر دفن کیا جائے۔" چنانچہ ان کی وصیت کے مطابق ایسا ہی کیا گیا۔

علامہ اقبال کو حضرت قدسی سے خاص عقیدت تھی۔ اس کی نمایاں وجہ یہ تھی کہ اقبال کے مرشد حضرت گل حسن شاہ قلندرؒ کو حضرت سے خاص تعلق تھا، نیز ان کے خلیفہ حضرت فضل شاہ قلندر کشمیری آستانہ قدسی پر اکثر حاضری دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ علامہ اقبال حضرت مرحوم سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، آپ ہی کی تحریک پر علامہ نے "جواب شکوہ"

جیسی شہرۂ آفاق نظم لکھی تھی، علامہ اقبال نے قیام بھوپال کے زمانہ میں آستانے پر حاضری دی، اور وہاں کے روح پرور ماحول سے متاثر ہو کر یہ قطعہ لکھا تھا،

چشمۂ فیض تشنہ لب کے لیے — مرکز رشد بہر اہلِ صفا
کوئی سمجھے تو ہے مقامِ قدس — آستانہ جناب قدسی کا

قیام پاکستان کے بعد آپ ہجرت کر کے پہلے کوئٹہ آئے۔ پھر سندھ کے مقام تھانہ بھولا خاں میں سکونت اختیار کی، پھر وہاں سے کوٹری تشریف لے آئے، یہاں کئی سال قیام کرنے کے بعد بہاول پور تشریف لے گئے، پھر وہاں سے نقل مکان کر کے چکوال آئے، اور کچھ عرصہ بعد بھون میں ایک وسیع و عریض رقبہ میں آستانہ قدسی کی تعمیر عمل میں آئی۔ اور پھر آپ نے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

افسوس، صد افسوس! اس گراں مایہ ہستی نے ۸۸ سال کی عمر میں آستانۂ قدسی بھون میں ۲۴ نومبر ۱۹۷۸ء کی شام کو وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، دوسرے دن جمعہ کو بعد نماز عصر اپنی وصیت کے مطابق آستانۂ قدسی میں مدفون ہوئے۔ مجھ جیسے روسیاہ کی زبان اس لائق نہیں کہ ایسی مقدس شخصیت کے لئے دعائے مغفرت کرے۔

استدراک

از منصور نعمانی ندوی رفیق دار المصنفین

جون و جولائی ۷۸ء کے معارف کی دو قسطوں میں شیخ عبد القادر عیدروسی کی سوانح خدمات اور تصانیف پر ایک مضمون سپرد قلم کیا گیا تھا، مضمون ختم کرنے کے بعد کچھ مواد اور دستیاب ہوا تھا اور مزید تلاش جاری تھی کہ معارف کے قدرداں جناب ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی نے تصانیف کے سلسلہ میں کچھ مزید مواد کی نشاندہی کی، ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی نے بتیس سال قبل عیدروسی کی شہرۂ آفاق کتاب "النور السافر" پر انگریزی میں ایک مضمون تحریر کیا تھا، جو مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی بڑودہ (گجرات) کے ادارہ شرق شناسی کے سہ ماہی رسالہ میں چھپ چکا ہے، ڈاکٹر صاحب نے ہم کو یہ خبر بھی دی ہے کہ ڈاکٹر باقر علی ترمذی مرحوم نے "گجرات اور اہل گجرات کا عربی ادب میں حصہ" کے موضوع پر بمبئی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کیا ہے، مگر افسوس ہے کہ یہ مقالہ طبع نہ ہو سکا، اس کا ایک ٹائپ شدہ نسخہ بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، اس مقالہ میں عیدروسی کی تصانیف کی تعداد کتابچوں اور تقریظوں کے ساتھ ۴۲ تحریر کی ہے، ڈاکٹر زبید احمد کی کتاب دیکھی تو اس میں تعداد ۳۳ ہے، اور ہم نے صرف ۲۰ کتابوں کا تعارف معارف میں کرایا تھا اور کل ۲۰ ہی کتابوں کا حتمی دعویٰ بھی نہیں کیا تھا، ذیل میں النور السافر، خلاصۃ الاثر، زبید احمد، فہرست بوہار اور ڈاکٹر باقر علی ترمذی کے قلمی نسخہ کی منقولہ یادداشت

سے ہم باقی کتابوں اور اس کے متعلقات کو بطور استدراک درج کرتے ہیں۔

عیدروسی نے النور السافر میں اور محبی نے خلاصۃ الاثر میں تقریظ، رد اور اجازت پر مشتمل کتابچوں کا ذکر کیا ہے، مگر ہم نے تصانیف گناتے وقت قصداً ان کو تصانیف میں شامل نہیں کیا تھا، ڈاکٹر باقر علی ترمذی کی فہرست میں یہ کتابیں بھی درج ہیں، اسلئے ان کا ذکر کرتے ہیں۔

۲۹۔ تقریظ علی شرح قصیدہ البوصیری: یہ شیخ الاسلام عبدالملک بن عبدالسلام دعیین اموی الیمنی الشافعی کی شرح پر ایک تقریظ ہے۔ (النور السافر ص ۳۴۰ و خلاصۃ الاثر ۲/۴۴۲)

۳۰۔ تقریظ علی رسالۃ البسکری: مصنف نے اپنے شاگرد احمد بن علی البسکری کے اس مضمون پر لکھا ہے جس میں امام مالک کے متعلق ناروا باتیں تحریر کی ہیں، یہ امام مالک کی مدافعت میں ہے۔ (النور السافر ص ۳۴۰)

محبی نے اس کا نام "رد علی رسالۃ الشیخ احمد بن محمد بن علی البسکری" تحریر کیا ہے (خلاصہ ۲/۴۴۲) اور یہی زیادہ قرین قیاس ہے۔

۳۱۔ اجازۃ للفقیہ الصالح بن الفقیہ محمد باجابر: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، عیدروسی نے اپنے عزیز ترین شاگرد باجابر کو روایت حدیث اور بیعت کی اجازت دی۔ (النور السافر و خلاصہ ۲/۴۴۲)

۳۲۔ المقالۃ النافعہ والرسالۃ الجامعۃ: مصنف نے اپنے بعض قریبی عزیزوں کے اصرار پر اس رسالہ کو لکھا، اس میں مسائلِ تصوف سے بحث کی گئی ہے، اس کا ایک نسخہ بوہار میں اور ایک برلن میں پایا جاتا ہے۔ (فہرست بوہار ۲/۵۰۸ و زبید احمد ص ۳۰۵)

۳۳۔ القول الجامع فی بیان علم النافع: اس کتاب میں مشہور روایت "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ" پر صوفیانہ نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے،

مصنف نے علم سے مراد علمِ باطن لیا ہے، اس کے قلمی نسخے بوہار اور برلن میں موجود ہیں۔ (فہرست بوہار ۲/۵۰۸ و زبید احمد ص ۳۰۵)

۳۴۔ السلوک الی مالک الملوک: اس میں خدائے مالک الملک کے حضور میں راہِ طریقت کے ایک مسافر کے جذبات و تاثرات رقم کیے ہیں (مخطوطہ ڈاکٹر باقر علی ترمذی بمبئی)

۳۵۔ مراسلات عبدالقادر العیدروس و حاتم الاہدل: یہ عیدروسی اور ان کے استاذ حاتم الاہدل کے مکاتیب کا مجموعہ ہے جو صوفیانہ مکالمات پر مشتمل ہیں۔ اس کا ایک مخطوطہ برلن میں ہے (ایضاً) ڈاکٹر زبید احمد نے اس کو "المکاتیب" کا نام دیا ہے۔ (زبید احمد ص ۱۴۷) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں ہے کہ عیدروسی نے حاتم الاہدل کے ساتھ خط و کتابت کو اپنی تصنیف الدر الباسم من روض السید حاتم میں جمع کر دیا ہے۔ (دائرۂ معارف اسلامیہ اردو ۳/۵۷۲)

۳۶۔ التعلیقات علی ابیات العیدروسیہ: یہ صوفیانہ سلاسل پر اپنے والد شیخ بن عبداللہ عیدروس (متوفی ۹۹۰ھ) کے ایک منظوم رسالہ پر مفصل سوانحی تعلیق ہے۔ اس کا حوالہ ڈاکٹر باقر علی ترمذی بمبئی یونیورسٹی نے دیا ہے۔

۳۷۔ رسالۃ فی مناقب البخاری: یہ کتابچہ امام بخاریؒ کی خدمات و مناقب پر ہے، اس کا ایک مخطوطہ بوہار لائبریری نمبر ۵۳/۳۴ پر موجود ہے (بوہار ۲/۵۰۱)

۳۸۔ صفوۃ الصفوہ فی بیان احکام القہوہ: یہ کتابچہ قہوہ پینے کے جواز پر ہے، اس کا ایک مخطوطہ برلن میں ہے (زبید احمد ص ۳۲۶)

۳۹۔ الواسطہ: یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس میں تصوف کا غیر جانبدارانہ جائزہ ہے، مقدمہ میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ پیغمبر خدا اور بنی نوع انسان کے درمیان رابطہ کی ایک

درمیانی کڑی تھے، اس کی وضاحت میں مصنف نے اشرف الکلام واکمل تحیۃ السلام کے زیرعنوان ایک تفصیلی بحث کی ہے، اسکا مخطوطہ بھی برلن میں ہے (مخطوطہ ڈاکٹر باقر علی ترمذی بمبئی)

۴۰۔ ارجوزہ:۔ برلن کی اسٹیٹ لائبریری میں مصنف کے دیوان الروض الاریض کے حاشیہ پر ایک نظم ۲۲ اشعار پر رجزیہ بحر میں موجود ہے (زبید احمد ص ۳۰۶ و ڈاکٹر باقر علی ترمذی)

۴۱۔ موشح۔ دو مزید نظمیں ایک موشح میں ہے اور دوسری ۴۶ بند کے اشعار پر مشتمل ہے یہ بھی برلن لائبریری میں موجود ہے، نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ حیات انسانی دراصل ایک سفر ہے جس میں آخرت کے لیے زادِ سفر کی فراہمی ہونی چاہیئے. اس کے لیے اولین شرط تقوی ہے، یہ نظم تقریباً دس حصوں میں ہے، شاعر نے خود ہی اس نظم کی شرح بھی کی ہے، یہ شرح بھی برلن میں موجود ہے (ڈاکٹر باقر علی ترمذی و زبید احمد ص ۳۰۶)

۴۲۔ تحفۃ الغریب فی الصلوٰۃ علی البشیر النذیر:۔ رسولِ خدا پر درود وسلام ہے اور چار ابواب پر منقسم ہے، آخر میں مصنف نے بارگاہ رسالت مآب میں نذرانۂ عقیدت بھی پیش کیا ہے، اس کا واحد نسخہ بانکی پور میں موجود ہے۔ (ڈاکٹر باقر علی ترمذی مخطوطہ بمبئی)

۴۳۔ نفائس الانفاس و نسبۃ الخرقۃ والالباس:۔ یہ ارباب تصوف اور خرقہ پوشی کے مناقب و فضائل پر ہے، اسکا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں ہے، مخطوطہ کا نمبر ۱۳۸۸ ہے (فہرست انڈیا آفس لائبریری عربی ۲/۱۰۸ و زبید احمد ص ۳۰۶)

ان سب کتابوں کو ملا کر اب عیدروسی کی تصانیف کی تعداد ۴۳ ہو جاتی ہے، ممکن ہے کتب خانوں کی فہرستوں میں ابھی کچھ اور کتابیں دستیاب ہو جائیں، تاریخ بروکلمن میں بھی شاید اس سلسلہ میں کچھ تصانیف کا پتہ چل جائے، مگر یہ ہمارے کتب خانہ میں موجود نہیں ہے،

ڈاکٹر باقر علی ترمذی کی فہرست میں ایک کتاب کا نام "نہایۃ الطلب" تحریر کیا گیا ہے، معارف جولائی ۷۹ء صفحہ ۳۹ پر ہم نے عیدروسی کی کتاب النور السافر سے اس کا صحیح نام "غایۃ القرب فی شرح نہایۃ الطلب" نقل کیا ہے، یہ تصنیف نہیں شرح ہے تفصیل کے لیے دیکھئے (النور السافر ص ۳۳۹)

معارف کے مذکورہ شمارہ میں تصانیف کے ذیل میں کچھ کتابوں کے نسخوں کی نشاندہی نہیں کی گئی تھی، اب ان کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے، اسکی طرف جناب ضیاء الدین ڈیسائی صاحب نے توجہ دلائی ہے،

الفتوحات القدوسیہ فی الخرقۃ العیدروسیہ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے،

اتحاف الحضرۃ العزیزہ بعیون السیر الوجیزہ:۔ اس کا نسخہ برلن میں ہے (ڈاکٹر باقر علی و زبید احمد)

المنہاج الی معرفۃ المعراج: اس کا نسخہ برلن میں نمبر ۲۶۰۹ پر ہے (زبید احمد ص ۳۲۵)

الانموذج اللطیف فی اہل بدر الشریف:۔ مصنف کا خود نوشت نسخہ احمد آباد میں ہے (مخطوطہ ڈاکٹر باقر علی ترمذی بمبئی)

اسباب النجاۃ والنجاح فی اذکار المساء والصباح:۔ اس کا نسخہ برلن میں بھی ہے (دیورڈ ۳/۱۰۷۱ زبید احمد ص ۳۰۶)

الدر الثمین فی بیان المہم من علم الدین:۔ اس کا ایک نسخہ بوہار میں اور ایک نسخہ برلن میں ہے۔ (بوہار ۲/۴۹۹)

بغیۃ المستفید فی شرح تحفۃ المرید: اس کا نسخہ برلن میں بھی ہے، (ایورڈ ۴۵۰ و زبید احمد ص ۳۰۶)

غایۃ القریب فی شرح نہایۃ الطلب :- اس کا نسخہ برلن میں ہے (ایورڈ ۳۲۲۱ زبید احمد ص ۳۰۶)

الاعتقادیہ :- اس کا ایک نسخہ بوہار میں اور ایک برلن میں ہے (فہرست بوہار ۲/۵۰۰)

الزہر الباسم فی روض حاتم :- اس کا ایک نسخہ مکتوبہ ۱۰۱۶ھ انڈیا آفس میں ہے۔ (مخطوطات عربی انڈیا آفس ص ۱۶۱)

النور السافر کے ذیل کے سلسلہ میں جولائی ۱۹۷۹ء کے شمارہ صفحہ ۵۰ پر لکھا گیا تھا کہ

"اس کا ایک ذیل شلی متوفی ۱۰۹۳ھ نے لکھا ہے، جو المشرع الروی کے نام سے مشہور ہے"

یہ ذیل ہماری نظر سے نہیں گزرا، ڈاکٹر ڈیسائی نے توجہ دلائی تو اس کے نام کی تحقیق کی گئی، درحقیقت یہ ذیل شلی ہی کا ہے، مگر اس کا نام "السنا الباہر بتکمیل النور السافر" ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مصر میں بتایا جاتا ہے۔ (الاعلام ۳/۸۷۳)

سال وفات | ڈاکٹر زبید احمد نے عیدروسی کا سال وفات ایک جگہ ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۵ درج کیا ہے۔ (زبید احمد ص ۲۱۷)۔ اسی طرح صاحب المشرع الروی نے (۲/۱۴۷) سال وفات ۱۰۴۸ھ اور انھی کے تتبع میں تاریخ الشعراء الحضرمیین کے مصنف نے ۱۰۴۸ھ لکھا ہے۔ (الاعلام جدید ایڈیشن ۴/۱۶۴)۔ جبکہ صحیح تاریخ وفات ۱۰۳۸ھ ہے، حسب صاحب حدائق نے ان کی تاریخ وفات "شمع بیت پناہ" سے نکالی ہے۔ (حدائق الحنفیہ ص ۴۰۰)

عرب و ہند کے تعلقات

عرب و ہند کے تعلقات پر مولانا سید سلیمان ندوی کے ان خطبات کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد میں دیے تھے،

طبع جدید معارف پریس اعظم گڈھ۔ قیمت

مولانا عبدالسلام قدوائی کی یاد میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱)

لاہور - ۱۱ر نومبر ۷۹ء

معظمی و محترمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا، "معارف" پابندی سے مل رہا ہے، نوازش کا بے حد شکریہ، اس اندوہناک خبر سے بے حد رنج ہوا کہ آپ کے دوست اور مخلص رفیق کار مولانا عبدالسلام قدوائی اللہ کو پیارے ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، خداوند تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ سب لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے، دست بدعا ہوں کہ آپ جیسے بزرگوں کا سایہ خداوند تعالیٰ تا دیر قائم رکھے، مولانا کی موت کا سانحہ واقعی دارالمصنفین کے لئے ایک بہت بڑا صدمہ ہے، مگر موت سے کس کو رستگاری ہے، انسان سخت جان ہے، بڑے بڑے صدمے برداشت کر لیتا ہے، ہر چہ

آید بہ سر اولاد آدم بگذار،

ستمبر کے "معارف" میں شذرات کے تحت مرحوم کے متعلق آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا، وہ میں نے اشک بار آنکھوں سے پڑھا، اور دل کی عجیب کیفیت ہوئی، کار لائقہ سے یاد فرمائیں،

فقط والسلام نیاز مند (ڈاکٹر) محمد معز الدین، ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی، پاکستان،

(۲) مکرمی - السلام علیکم

مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم کی رحلت سے میں ذاتی طور پر بہت غمزدہ ہوں، مجھ سے بیحد شفقت

فرماتے تھے، اُن کی یاد برابر آتی ہے، جب سوچتی ہوں، آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں، انہی سوگوار کیفیت میں کچھ اشعار قلمبند ہو گئے ہیں، جو معارف کے لئے بھیج رہی ہوں، اگر مناسب سمجھیں تو معارف میں شائع کر کے ممنون فرمائیں،

بیگم احتشام ندوی، ضیاء

غم زدہ ہے آج بزم فکر و فن تیرے لئے
مدتوں روئے گی شمع انجمن تیرے لیے

نیک باطن نیک طینت سادہ دل شیریں کلام
نازش اہل وطن اے پاک دل عبدالسلام

تیرے غم میں آج ہے چشم تہو لیبندی اشکبار
تیری فرقت سے ہوئے ہندو و مسلم بیقرار

یاد تیری سوگواروں کو سدا تڑپائے گی
تجھ سا فرزند آہ کیا ارض وطن پھر پائیگی

نالہ کش ہیں آہ اب تیرے چمن کے عندلیب
ہو گئے احباب اہل خانداں حرماں نصیب

آئینہ فطرت، فرشتہ خصلت و عالی مقام
جامعہ ندوہ میں جو تھا قابل صد احترام

لب پہ استغفار تھا گویا سفر کا اختتام
کتنی آسانی سے کر لی منزل آخر تمام

ماہ تھا رمضان کا، وقت اذان جمعہ تھا
تیرے استقبال کا حق نے کیا کیا انتظام

خلد کو بھی تھا ترے قدموں کا شاید انتظار
اور تھی آغوش کھولے رحمت پروردگار

اُٹھ گیا محفل سے اب وہ عالم روشن دماغ
ہو گیا گویا کہ گُل اک بزم شبلی کا چراغ

باب التقریظ والانتقاد

ابو اسحاق ابراہیم اور ان کی کتاب التاجی[1]

از پروفیسر خواجہ مجیب الحق ایم اے باراسات گورنمنٹ کالج، مغربی بنگال۔

چوتھی صدی ہجری یعنی دسویں صدی عیسوی عربی تاریخ نگاری کے لئے نہایت اہم صدی ہے اور تاریخ کی بہت سی اہم کتابوں کے علاوہ اسی صدی میں الطبری کی تاریخ الرسل والملوک اور المسعودی کی مروج الذہب تکمیل کو پہونچی، اسی صدی میں ثابت بن سنان کی تاریخ اور مسکویہ کی تجارب الامم کے علاوہ ابو اسحاق ابراہیم الصابی کی ایک سرکاری تاریخ کتاب التاجی بھی لکھی گئی تھی اس مقالے کا تعلق اسی کتاب سے ہے،

کتاب کا نام اس کتاب کا نام جیسا کہ اس کے ایک نادر مخطوطے کے صفحہ اول پر درج ہے "کتاب المنتزع من الکتاب المعروف بالتاجی فی اخبار او آثار الدولۃ الدیلمیۃ" ہے، یا مختصراً کتاب التاجی ہے، کیونکہ یہ مشہور بویہی حکمراں عضد الدولہ کے حکم سے لکھی گئی تھی جس کا لقب "تاج الملۃ" تھا۔

اس کا نادر مخطوطہ یہ مخطوطہ زیدی فقہ کی ایک کتاب الجامع الکافی کے آخر میں پایا گیا ہے، الجامع الکبیر صنعاء (یمن) کے المکتبۃ المتوکلیہ میں یہ مخطوطہ موجود ہے، اور اس کا نمبر ۱۲۵ ہے، اس کی مائکروفلم دار الکتب المصریہ قاہرہ میں شمارہ نمبر ۲۰۵ کے تحت محفوظ ہے، یہ نادر مخطوطہ ۲۲ اوراق یعنی ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر ۲۳ سطریں خوبصورت خط نسخ میں لکھی گئی ہیں، پورے مخطوطہ میں خالص عربی حروف ط، ح، د کے نیچے ایک نقطہ دیا گیا ہے، کاتب کی تحریر کی خاص خصوصیات میں سے

---

[1] میرا یہ مقالہ اس عربی مقدمہ سے ماخوذ ہے جسے پروفیسر محمد صابر خان صاحب نے کتاب التاجی کے ایڈیشن اور ترجمے کے ساتھ شائع کیا ہے، یہ کتاب بنیاد فرہنگ ایران، تہران کی طرف سے امسال شائع ہو چکی ہے۔

ایک یہ ہے کہ وہ بہت سے الفاظ اور اعلام کو موجودہ املا کے مطابق نہیں لکھتے، مثلاً وہ ہمیشہ یسالک کو یسئلہ، حضرۃ کو حضرت، ابوالحسین کو بلحسین، القاسم کو القسم، ہارون کو ہرون، لیلی بن نعمان کو لیلی ابن النعمان، الرضا کو الرضی لکھتے ہیں، اس کے علاوہ اختتامیہ یائے معروف کی جگہ ہمیشہ الف لکھتے ہیں، مثلاً کمتی کی جگہ کمتا، سوی کے بدلے سوا، اور دعا کے بدلے دعی لکھتے ہیں، اس کا پہلا صفحہ موجود نہیں ہے جس کی وجہ سے اس میں کتاب اور مصنف کے نام نہیں ملتے، اس کے آخر میں کاتب کا نام اور سنہ کتابت بھی نہیں ہے، المنتزع کا متن ورق ۱۶ یا صفحہ نمبر ۳۱ کے وسط میں ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد کسی دوسری کتاب کا متن منسلک ہے، ۲۱ جگہوں پر بیاض چھوڑ دی گئی ہے، اس کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مخطوطہ ایران یا یمن کے کسی مقام پر لکھا گیا ہے، چونکہ اس میں جا بجا املا اور صرف و نحو کی غلطیاں موجود ہیں اس لئے اس کا کاتب کوئی عالم نہیں بیشہ ور کاتب معلوم ہوتا ہے، مخطوطہ کی عام خصوصیات، طرز تحریر اور اس کے صفحہ ۲۲ پر جو سال ۶۰۵/۱۲۰۹ درج ہے، ان سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ مخطوطہ ساتویں صدی ہجری یا تیرہویں صدی عیسوی میں لکھا گیا ہے، اس مخطوطہ کا کوئی جز ضائع نہیں ہوا، اس لئے یہ اپنی جگہ پر مکمل ہے، کوشش کے باوجود یہ پتہ نہ چل سکا کہ کتاب التاجی کا خلاصہ جو اس مخطوطہ میں موجود ہے کس نے کیا تھا، یہ صاف ظاہر ہے کہ اس مخطوطے کا کاتب اور اس کا خلاصہ تیار کرنے والا ایک شخص نہیں ہے، میرا خیال ہے کہ اس کتاب کا خلاصہ کرنے والا ضرور کوئی زیدی شیعہ تھا۔

صابی کے حالاتِ زندگی | اس کاتب اور مورخ کا پورا نام ابو اسحاق ابراہیم بن ہلال بن ابراہیم بن زہرون بن حبون الحرانی الصابی ہے، وہ ۳۱۳/۹۲۶ میں پیدا ہوئے اور ان کی ابتدائی زندگی بغداد میں گذری، اگرچہ وہ مذہباً صابی تھے لیکن اسلام کا بڑا احترام کرتے تھے، وہ رمضان میں روزے رکھتے تھے اور قرآن کے حافظ تھے۔

اگرچہ ان کے والد ایک کامیاب طبیب تھے، لیکن ابو اسحاق کو ادب سے غیر معمولی دلچسپی تھی، وہ پہلے بویہی حکمراں امیر معز الدولہ (متوفی ۳۵۶/۹۶۹) کے وزیر المہلبی کے دربار سے وابستہ ہوئے پھر دیوان الانشاء میں امیر معز الدولہ کے کاتب کی حیثیت سے کام کیا، امیر موصوف کے انتقال کے بعد وہ ان کے بیٹے امیر بختیار کے کاتب کی حیثیت سے کام کرنے لگے، جب بختیار نے عضد الدولہ سے شکست کھائی اور انھیں قتل کر دیا گیا تو عضد الدولہ نے بعض اسباب سے ابو اسحاق کو قید کر دیا، عضد الدولہ کے حکم پر جب انھوں نے کتاب التاجی لکھی تو وہ قید سے رہا کر دئے گئے، انھوں نے ۱۲ شوال ۳۸۴ھ مطابق ۱۹ نومبر ۹۹۴ء کو بعمر ۷۱ سال انتقال کیا۔

کتاب التاجی | ان حالات کی تفصیل جن کے تحت ابو اسحاق نے تاجی لکھی، پروفیسر محمد صابر خان کے مذکورہ انگریزی اڈیشن کے مقدمہ میں موجود ہے، بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ابو اسحاق نے اس کتاب کو ۳۷۰/۹۸۰ میں عضد الدولہ کے حکم سے قید خانہ میں لکھنا شروع کیا تھا، ثبوت موجود ہیں کہ اس کی تکمیل ۳۷۱/۹۸۲ میں ہوئی، کہا جاتا ہے کہ عضد الدولہ بذات خود اس پر نظر ثانی کرتے تھے اور جب وہ مکمل ہو گئی تو اس کا ایک صاف نسخہ شاہی کتب خانے میں رکھ دیا، ابو حیان التوحیدی (۴۱۴/۱۰۲۳) العتبی (۴۱۳/۱۰۲۲) ابن الندیم (۳۸۵/۹۹۵) البیہقی (۴۷۰/۱۰۰۷) البیرونی (۴۳۹/۱۰۴۸) ابن حصول (۴۵۵/۱۰۶۳) اور ابو شجاع الروذراوری (۴۸۸/۱۰۹۵) نے اس کتاب کا ذکر کتاب التاجی یا صرف التاجی یا کتاب تاجی یا کتاب التاج کے نام سے کیا ہے۔

اصول تحقیق | اس کا عربی متن پروفیسر محمد صابر خان صاحب کی تصحیح کے ساتھ شائع ہو گیا ہے، اس میں دو طویل مقدمے ہیں، ایک عربی میں اور دوسرا انگریزی میں، بہت تفصیلی حواشی اور تعلیقات کے علاوہ اس میں اعلام و اماکن کی فہرستیں بھی دی گئی ہیں،

کسی نادر و نایاب مخطوطے کا متن پیش کرنا ایک مشکل کام ہے، پروفیسر صابر خان صاحب نے

اس کی پوری کوشش کی ہے کہ اصل متن کی عبارت اور الفاظ میں کوئی ترمیم و تنسیخ نہ کی جائے، جہاں تصحیح بالکل
ضروری سمجھی گئی ہے، وہاں یہ اصل متن میں کر دی گئی ہے جس کا مقصد نہ صرف نقص کی اصلاح ہے بلکہ صحیح نص کو معلوم
کرنا بھی ہے، جسے مصنف نے وضع کیا تھا اور مخطوطے کے غلط الفاظ اور ان کی شکلیں حواشی میں دے دی
گئی ہیں، بیاض کے سیاق و سباق کے مطابق موزوں الفاظ سے خانہ پُری کی گئی ہے اور ان کو قوسین
( ) سے ظاہر کیا گیا ہے، جہاں جہاں پر کوئی بیاض نہیں ہے لیکن کاتب سے ضروری الفاظ
لکھنے سے چھوٹ گئے ہیں، وہاں پر ایسے الفاظ اپنی طرف سے ضرورت کے تحت بڑھا دئے گئے ہیں تاکہ
ان سے صحیح مفہوم واضح ہو جائے، ایسے الفاظ کو بھی حاجزین [ ] کے درمیان دکھایا گیا ہے، پانچ جگہوں پر
جو الفاظ اس مخطوطے میں حاشیہ پر لکھے گئے ہیں، ان کو متن میں شامل کر لیا گیا ہے، اور ان کا ذکر حواشی
میں موجود ہے، جو اعلم الملمۃ یا کوئی دوسرا لفظ پڑھا نہیں جا سکا ان کی جگہ پر اصل متن میں پانچ نقطے
دے دیئے گئے ہیں، پورے متن کو چھوٹی چھوٹی مناسب عبارتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

أن، إن اور انّ پر مستقل ہمزۂ القطع لگائے گئے ہیں، لیکن الیٰ پر نہیں لگایا گیا، جب تک کہ
اس کے بعد کوئی ضمیر نہ آئی ہو، ہر جگہ تشدید لگائی گئی ہے سوائے ان حرفوں کے جو کسی اسم معرفہ کے قمری
حروف سے تعلق رکھتے ہوں، تثنیہ پر صرف دو ہی اعراب لگائے گئے ہیں جن کی شکلیں صیغہ جمع کی سی ہیں۔
تاکہ دونوں میں امتیاز کیا جا سکے، تمام مجہول کو ظاہر کرنے کے لئے فعل مضارع کے پہلے حرف پر ضمہ لگایا
گیا ہے، اور ماضی کے پہلے حرف پر ضمہ اور تیسرے حرف پر فتحہ لگایا گیا ہے، جہاں ضرورت محسوس
کی گئی ہے وہاں کسی لفظ کے آخر میں اگر الف ہو تو اس پر تنوین لگا دی گئی ہے۔

کتاب کی اہمیت اس کتاب کی تاریخی حیثیت و اہمیت کے لئے اتنا کہنا کافی ہے کہ اس سے دیلم اور گیلان
کی تاریخ کے ایک ایسے باب پر روشنی پڑتی ہے جس پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جس کے حالات عام طور پر
معلوم نہیں ہیں، یعنی طبرستان میں زیدی اماموں کی حکومت کی تاریخ، اس کے علاوہ بنو بویہ کے آباد اجداد

یعنی دیالمہ کے حالات عام طور پر کہیں نہیں ملتے، لیکن اس کتاب میں دیالمہ کے حالات موجود ہیں جو بنو بویہ
کی تاریخ کے لئے پس منظر کا کام دے سکتے ہیں، طبرستان کے زیدی حکمرانوں کی تاریخ، بخارا اور خراسان کے
بنو سامان سے متعلق ہے اس لئے اس کتاب سے بنو سامان کی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے، اس میں زیدی
خاندان کے مشہور و معروف حکمرانوں کی تاریخ کے علاوہ بہت سے ایسے بھی حکمرانوں کی تاریخ موجود ہے جو کم
معروف تھے اور جن کے حالات تاریخ کی عام کتابوں میں نہیں ملتے، بوسم جان زیدی حکمرانوں کا دار السلطنت
تھا، اس کی معلومات افزا تاریخ بھی اس کتاب میں موجود ہے جو اور کسی تاریخ میں نہیں ملتی، اس میں بعض
مقامی حکمراں خاندان مثلاً سجستان کے بنو صفار، طبرستان کے بنو بادوسفان، دیلم اور آذربائجان کے
بنو مسافر یا بنو سلار یا بنو لنگر، آذربائجان کے بنو دھسودان کی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے، اس کتاب سے
دیلم یا جبل کے بنو جستان اور طبرستان اور جرجان کے جبلی حکمراں بنو زیار کے بھی کچھ حالات معلوم ہوتے
ہیں، اس کی اہمیت کے متعلق تفصیلی بحث پروفیسر عابر خاں صاحب کے ایڈیشن کے انگریزی مقدمہ
میں موجود ہے۔

اس انگریزی مقدمہ میں جو ۱۱۰ صفحے پر مشتمل ہے اور باتوں کے علاوہ اس کتاب کے ضروری
ماخذ سے بھی بحث کی گئی ہے جو تاریخی کتابیں ہیں اور تاجی کی تصنیف سے پہلے لکھی گئی ہیں، یہ
تقریباً یقینی ہے کہ تاجی کا ایک ماخذ الطبری کی تاریخ الرسل والملوک ہے، لیکن ابو اسحاق نے اس کا
اعتراف نہیں کیا ہے، لیکن یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ تاریخ کی اور کون سی کتابوں سے ابو اسحاق
نے تاجی لکھنے میں استفادہ کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل اور مکمل تاجی کا کوئی مخطوطہ اب تک ہمیں
نہیں ملا ہے، اس میں ان لوگوں کا ذکر بھی ہے جنھوں نے عینی مشاہدہ کی بنا پر ابو اسحاق کے لئے
ضروری تاریخی معلومات فراہم کئے، اس کے بعد مختلف علوم و فنون کی کتابیں جن کے مصنفین شیعہ
بھی ہیں اور سنی بھی زیر بحث لائی گئی ہیں، جو ہمیں اس کتاب سے متعلق تین بنیادی سوالوں کے

جواب دینے میں مدد دیتی ہیں۔

اول یہ کہ جو تاریخی واقعات اس کتاب میں درج ہیں، وہ کس حد تک صحیح ہیں؟

دوم یہ کہ اس کتاب میں وہ کون سی نئی معلومات ہیں جن کی بنا پر اسے ایک اہم تاریخی کتاب قرار دیا جا سکتا ہے؟

سوم یہ کہ ہم یہ معلوم کر سکیں کہ آیا اس میں غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے یا نہیں؟ نیز اس میں کون کون سی غلطیاں ہیں؟

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کتاب التاجی ایک اہم اور معتبر تاریخی کتاب سمجھی جاتی رہی ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ بہت سے معتبر اور معزز مورخینِ اسلام نے اپنا ماخذ قرار دے کر اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے بہت سے عرب اور ایرانی مورخین مثلاً البیرونی، ابن حوقل، ابن اسفندیار، ابن الاثیر، ابن خلکان، ابن خلدون، حمد اللہ مستوفی قزوینی، ظہیر الدین مرعشی، میر خواند، خواند میر، اور دیگر مورخین جنھوں نے بنو بویہ کا شجرۂ نسب پیش کیا ہے، کتاب التاجی کو خاص طور پر اپنا ماخذ بنایا ہے، بعض عرب اور ایرانی مورخین نے تاجی سے استفادہ کیا ہے، لیکن اپنی کتابوں میں اس کا تذکرہ نہیں کیا، مثلاً ابو الفدا نے طبرستان کے علوی حکمرانوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اور جو لندن کے ایک مخطوطہ میں محفوظ ہے، اس کا ماخذ تاجی ہے، لیکن ابو الفدا نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا، بنو بویہ کے بارے میں ابو الفدا نے اس مخطوطہ میں جو کچھ لکھا ہے اس میں دو جگہ ابو اسحاق کا ذکر بطور اپنے ماخذ کے کیا ہے، لیکن یہ عین ممکن ہے کہ علویانِ طبرستان کی تاریخ لکھنے میں بھی انھوں نے کتاب التاجی کو ہی براہ راست یا ابن ظفیر الازدی (متوفی ۶۱۳/ ۱۲۱۶) کی کتاب الدول المنقطعہ کے واسطے سے اپنا مستند ماخذ بنایا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ بنی بویہ کی تاریخ لکھنے میں النویری نے بھی

الازدی کے بالواسطہ تاجی سے استفادہ کیا ہو، لیکن النویری نے اس کا اعتراف نہیں کیا ہے،

ایسے بھی مورخین ہیں جو یا تو تاجی سے براہ راست واقف تھے یا اس سے کسی واسطہ سے استفادہ کیا ہے، لیکن ان کا ذکر یقینی طور پر کرنا اس وقت ممکن نہیں، کیونکہ تاجی کا پورا متن ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے، ان میں سے بعض مورخین ایسے ہیں جنھوں نے صرف تاجی ہی کو اپنا ماخذ بنایا ہوگا،

ابن اسفندیار نے اپنی کتاب 'تاریخ طبرستان' میں بنی بویہ کی تاریخ لکھتے ہوئے تاجی کا حوالہ صرف ایک جگہ دیا ہے، حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ علوی حکمرانوں کی تاریخ لکھنے میں انھوں نے تاجی سے کافی استفادہ کیا ہے۔

بعض مورخین جنھوں نے تاجی کو بنیاد بنا کر تاریخیں لکھی ہیں، وہ اس کی اصل عبارتوں کو مکمل طور پر نقل نہیں کرتے، وہ عام طور پر اس کا خلاصہ یا نچوڑ اپنے الفاظ میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہمیں اس مخطوطہ کی اہمیت پر بحث کرنے میں بہت زیادہ مدد نہیں ملتی۔

مندرجۂ ذیل مصنفین اور مورخین نے بھی یا تو تاجی سے استفادہ کیا ہے یا اس سے واقف تھے، العظیمی نے حلب کی غیر مذہبی تاریخ لکھنے میں اس سے مدد لی ہے، ابن ماکولا (متوفی ۴۷۵/ ۱۰۸۲) اور الہمدانی نے بھی شاید تاجی کو بطور ماخذ استعمال کیا ہے، یاقوت الحموی نے اپنی کتاب 'معجم البلدان' لکھنے میں اس سے مدد لی ہے اور السخاوی نے اپنی کتاب 'الاعلان بالتوبیخ' میں خلفاء کی تاریخ کے ذیل میں تاجی کا ذکر کیا ہے، العوفی نے اپنی کتاب 'جوامع الحکایات' میں ایک واقعہ کے سلسلہ میں تاجی کو ماخذ بنایا ہے، مشہور ایرانی مورخ رشید الدین فضل اللہ (متوفی ۷۱۸/ ۱۳۱۸) نے بھی عضد الدولہ اور اس کے چچازاد بھائی بختیار کی باہمی جنگ کے سلسلہ میں کتاب التاجی کا ذکر کیا ہے، اولیاء اللہ آملی نے اپنی کتاب 'تاریخ ادیان' میں اس سے استفادہ کیا ہے، غرض یہ کہ کتاب التاجی ایک نہایت اہم عربی تاریخ ہے،

مطبوعات جدیدہ

شریف التواریخ ۔ مرتبہ مولانا سید شریف احمد شرافت نوشاہی تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۷۰۶، مجلد قیمت ۔ ۵، روپے، پتے (۱) معارف نوشاہیہ ساہن پال ضلع گجرات، پاکستان (۲) ادارۂ معارف نوشاہیہ مکان ۱۶ مری اسٹریٹ ۱۶ شالامار ٹاؤن، لاہور۔

تصوف کے مشہور سلسلہ قادریہ کی ایک شاخ نوشاہیہ ہے، یہ حضرت حاجی محمد نوشہ گنج بخش علوی قادریؒ کی جانب منسوب ہے، مولانا سید شریف احمد شرافت اس وقت حضرت نوشہ کی درگاہ کے سجادہ نشین ہیں، انھوں نے نوشاہی سلسلۂ طریقت کی تاریخ تین ضخیم جلدوں میں لکھی ہے، یہ اس کی پہلی جلد ہے اس میں سلسلۂ نوشاہی کے چھبیس ۲۶ بزرگوں کا تذکرہ ہے، یہ جلد دو ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں ایک طویل مقدمہ ہے یہ آٹھ فصلوں میں منقسم ہے، اس میں مصنف نے شریف التواریخ کے ماخذ لی کی تعریف، ولایت کی حقیقت، اس کے درجات اور اولیاء کی قسمیں بیان کی ہیں، جیسے فرد الافراد، افراد، مفردون، فرد محبوب قطب الاقطاب، قطب، غوث، اوتاد، نقباء، نجباء، ابدال، اوتاد وغیرہ، ایک فصل میں احوال کے اعتبار سے مرید، مراد، پیر، کامل، اکمل، مکمل، قلندر، خضر، مجذوب، اور سالک وغیرہ کی قسموں کا ذکر ہے، پانچویں فصل میں اولیاء کی کرامات کے امکان و وقوع کو ثابت کیا گیا ہے، چھٹی فصل میں بیعت کا مطلب، اس کی قسمیں اور اس کے دلائل بیان ہوئے ہیں، آخری فصل میں تصوف و طریقت کے مشہور سلاسل کا ذکر ہے، اس کے آخر میں سلسلۂ قادریہ کی فضیلت بھی واضح کی ہے، دوسرے باب میں چھبیس ۲۶ فصلیں ہیں، ہر فصل میں سلسلۂ قادریہ نوشاہیہ کے بزرگوں کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ ہے، اس کی ابتدا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے ذکر جمیل سے کی گئی ہے، اور خاتمہ حضرت نوشہ گنج بخشؒ کے حالات پر ہوا ہے، درمیان میں حضرت علیؓ حضرت حسن بصریؒ، شیخ حبیب عجمیؒ، شیخ داؤد طائیؒ، معروف کرخیؒ، سری سقطیؒ، جنید بغدادیؒ، ابوبکر شبلیؒ، اور شیخ عبد القادر جیلانیؒ وغیرہ متعدد اکابر صوفیہ کا تذکرہ ہے، مصنف نے ہر بزرگ کے تذکرہ کے ضمن میں ان کے خلفاء، اولاد اور تلامذہ کے علاوہ ان سب اشخاص کے حالات بھی قلمبند کئے ہیں جن کا ذکر ضمناً آگیا ہے، اس طرح یہ کتاب متعدد صوفیہ کے حالات کا مجموعہ اور تصوف کے متعلق بہت سی مفید معلومات کا ذخیرہ ہے، اور اس سے مصنف کی محنت اور کد و کاوش کا اندازہ ہوتا ہے۔ مگر اس میں اطناب زیادہ ہے، اور رطب و یابس ہر قسم کی باتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ یہ تصوف کے بجائے تاریخ و تذکرہ کی کتاب لکھی گئی ہے تو تاریخ نویسی یا تذکرہ نگاری میں پایۂ اعتبار سے ساقط اور مرجوح اقوال سے احتراز ضروری ہے، مگر مصنف نے مورخانہ نقد و تحقیق سے کام نہیں لیا ہے، اولیاء کی کرامتوں کے وقوع، دوسرے انبیاءؑ پر رسول اللہ صلعم کی فضیلت اور حضرت علیؓ کی افضلیت وغیرہ کو ثابت کرنے کے لیے جن آیتوں اور حدیثوں سے استدلال کیا ہے، ان میں بحث و کلام کی بڑی گنجائش ہے، تفضیل علیؓ کو اہل سنت والجماعت کا مسلک بتانا سراسر غلط ہے، اس سلسلہ میں بعض اکابر کے جو اقوال نقل کئے ہیں، ان کی مطلقاً کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ خود ان ہی اکابر سے مشہور قول کے مطابق خلفائے ثلثہؓ کی تفضیل منقول ہے کتاب کی زبان اور اس کا انداز بیان قدیم طرز کا ہے، اس میں ناہمواری بھی ہے، کتاب کے تقریظ نگار محمد اقبال مجددی صاحب کو بھی اس کا احساس و اعتراف ہے، اور انھوں نے اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ یہ مصنف کی ناتجربہ کاری، عدم پختگی اور کم سنی کے زمانہ کی تصنیف ہے، مگر ان کی یہ توجیہ قابل قبول نہیں، اسے آب حیات یا شعر العجم کی طرح خواہ مخواہ دلچسپ بنانے کے شوق میں لسانی قلابازیاں اور خیالی گھوڑے نہیں دوڑائے، ان کتابوں کی زبان و بیان سے

اس کتاب کا کیا مقابلہ اور نسبت۔؟

اخلاقِ نبویؐ ۔ مرتبہ مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت آٹھ روپے۔ پتہ۔ الجمعیۃ بک ڈپو۔ جمعیۃ بلڈنگ گلی قاسم جان، دہلی ۶۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک اہم مقصد مکارمِ اخلاق کی تکمیل ہے، اسی لئے احادیث کا بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات وہدایات پر مشتمل ہے، محدثین نے اخلاقی احادیث و روایات کے علحدہ مجموعے مرتب کئے ہیں، اردو میں بھی اس کے کئی مجموعے پہلے چھپے ہیں، دار المصنفین کی مشہور ومقبول کتاب سیرۃ النبی جلد ششم کا بھی یہی موضوع ہے، اس میں اخلاق پر مختلف حیثیتوں سے بحث کرنے کے علاوہ فضائل ورذائلِ اخلاق کے زیر عنوان صحیح حدیثیں بھی جمع کردی گئی ہیں، مولانا عبد السلام ندوی مرحوم کی تاریخ اخلاق اسلامی میں بھی اخلاقی احادیث کا بڑا حصہ آگیا ہے، زیر نظر کتاب میں پیغمبر اسلام کی اخلاقی تعلیمات وہدایات مختلف عنوانات کے تحت اکٹھا کرکے ان کا سلیس اردو ترجمہ کیا گیا ہے، مصنف نے ہر عنوان کی مناسبت سے پہلے قرآنی آیات بھی نقل کردی ہیں، اور حدیثوں کی مختصر تشریح کرکے ان کا مفہوم ومنشا پوری طرح ظاہر کردیا ہے، یہ کتاب سہل اور آسان زبان اور دلنشین پیرایہ میں لکھی گئی ہے، تاکہ معمولی اور کم استعداد کے لوگ بھی اس سے اچھی طرح فائدہ اٹھا سکیں، امید ہے کہ یہ کتاب مقبول ہوگی۔

دیوانِ اثر ۔ مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۳۰۰، قیمت۔ اٹھارہ ۱۸ روپے۔ پتہ انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی۔

خواجہ محمد میر اثر دہلوی ایک صوفی منش بزرگ اور استادِ فن تھے، وہ خواجہ میر درد کے

چھوٹے بھائی، علم وعمل، تصوف واسرارِ طریقت اور شعر وسخن میں ان کے جانشین تھے، درد کی طرح ان کا کلام بھی سادگی، اصلیت اور سوز وگداز سے معمور، سہل ممتنع کا نمونہ اور اور سراپا انتخاب ہے، مگر ابھی تک ان کے حالات، کمالات اور شاعری کی جانب بہت کم توجہ کی گئی تھی، ڈاکٹر کامل قریشی صدر شعبۂ اردو کروڑی مل کالج دلی یونیورسٹی دلی اور اس کے اہلِ کمال کے بڑے قدرداں ہیں، انھوں نے خواجہ محمد میر اثر کی زندگی اور شاعری پر یہ تحقیقی مقالہ لکھ کر دلی یونیورسٹی سے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے، اس کے دو حصے ہیں، پہلے میں خواجہ صاحب کے خاندانی حالات، ان کی تعلیم وتربیت، بعض ابتدائی حالات وکمالات اور ولادت و وفات کے بارہ میں بڑی تحقیق ومحنت سے مفید معلومات تحریر کی ہیں، اس سلسلہ میں ان کے اجداد اور وفات کے بارہ میں مختلف روایتوں کی چھان بین کرکے متعدد غلط بیانات کی تردید کی گئی ہے، اسی حصہ میں اثر کی شاعری پر مفصل گفتگو کی گئی ہے، اس میں ان کی دو مثنویوں میں خواب وخیال اور بیان واقع اور پھر ان کے دیوان کا دیدہ ریزی سے جائزہ لیا ہے، اس سے جہاں اثر کی شاعری کی اہم خصوصیات اور ان کے شاعرانہ درجہ ومرتبہ کا اچھی طرح اندازہ ہوجاتا ہے، وہیں خود مرتب کے اچھے ادبی وتنقیدی ذوق کا بھی پتہ چلتا ہے، دوسرے حصہ میں خواجہ صاحب کے دیوان کا متن شایع کیا گیا ہے، اس کے آخر میں فارسی کلام اور مثنوی بیان واقع کا اس قدر حصہ شامل ہے جو میخانۂ درد میں شایع ہوا تھا، حواشی میں نسخوں کے فرق واختلاف کی مفصل تصریح کی گئی ہے، یہ دیوان چار قلمی اور دو مطبوعہ نسخوں کو پیش نظر رکھکر ایڈٹ کیا گیا ہے، اور متن کی ترتیب وتصحیح میں کئی بیاضوں اور متعدد تذکروں سے بھی مدد لی گئی ہے، مقدمہ میں مخطوطہ ومطبوعہ نسخوں کے بارہ میں ضروری معلومات درج ہیں، آخر میں اسمار واعلام کا اشاریہ اور فرہنگ بھی ہے، ڈاکٹر کامل قریشی اس مفید ادبی خدمت کے لئے اربابِ ذوق کی تحسین کے مستحق ہیں۔

مدراس میں اردو ادب کی نشو ونما۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد فضل الدین اقبال صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت طباعت اچھی، صفحات ۴۰۶، قیمت بیس روپے، پتے آندھرا پردیش اردو اکیڈمی، حیدر آباد۔

دکن اردو کا پرانا اور بڑا مرکز تھا، گولکنڈہ اور بیجاپور کی ریاستیں ختم ہوئیں تو یہاں کے ارباب کمال نے ارکاٹ کا رخ کیا، اس طرح وہاں بھی اردو کا غلغلہ بلند ہوا، اس کتاب میں مدراس میں اردو ادب کی نشو ونما کا جائزہ لیا گیا ہے، یہ مصنف کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد نے ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی ہے، اس کے دو حصے ہیں، ابھی صرف پہلا حصہ شائع ہوا ہے، یہ تین ابواب کا مجموعہ ہے، پہلے باب کی حیثیت تمہید کی ہے، اس میں ہندوستان کی تمدنی تاریخ میں جنوبی ہند کی اہمیت دکھائی ہے، اس سلسلہ میں وہاں کی قدیم حکومتوں، اس کے شمالی ہند پر اثرات، اس کے ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ملکوں اور عہد وسطیٰ میں عرب ملکوں اور ترکی اور ایران سے تعلقات کا ذکر بھی آگیا ہے، اور انگریزوں کی آمد، ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام اور کرناٹک میں اردو کے ابتدائی نمونے بھی دیے ہیں، دوسرے باب میں ارکاٹ کے نوابوں کے عہد کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے، اس میں اس کے سیاسی، تمدنی، معاشی اور مذہبی حالات کا ذکر بھی ہے، تیسرے باب میں فورٹ سینٹ جارج کالج کے قیام کی سرگذشت بیان کی گئی ہے، اور اس کے کارکنوں اور مدرسین و مصنفین کے حالات اور تصنیفات کا مختصر تعارف کرایا ہے، اس سلسلہ میں اعظم گڈھ کے قصبہ ماہل کے مولوی حسن علی ماہلی کا ذکر بھی ہے، ان پر کئی برس پہلے معارف میں ایک مفصل مضمون شائع ہوا تھا، غالباً وہ مصنف کی نظر سے نہیں گذرا، ایک جگہ لکھتے ہیں: "سیرت طیبہ کی ایک قدیم کتاب سیرت شامی اور حدیث کی ایک قدیم مستدرک سے معلوم ہوتا ہے" سیرت شامی کوئی کتاب نہیں ہے، غالباً مصنف کی مراد سیرت ابن ہشام سے ہے، اور "حدیث کی ایک قدیم مستدرک" کے بجائے "حدیث کی ایک قدیم کتاب مستدرک حاکم" لکھنا چاہیے تھا، مشائخ کی جمع الجمع مشائخین غلط ہے، ایک جگہ زنجیر نسل کو زنجیل نسل لکھا ہے، ابھی تک اس موضوع پر کوئی اچھی کتاب موجود نہیں تھی، اس کتاب سے یہ کمی پوری ہوگئی، اس سے مصنف کی محنت اور سلیقہ کا پتہ چلتا ہے،

(ض)